الرسالہ
Al-Risala

June 1996 • Issue 235 • Rs. 7

وہ مسئلہ مسئلہ نہیں جس کا حل اپنے قابو میں ہو

اور بیشتر مسائل کا حل ہمیشہ اپنے ہی قابو میں ہوتا ہے۔

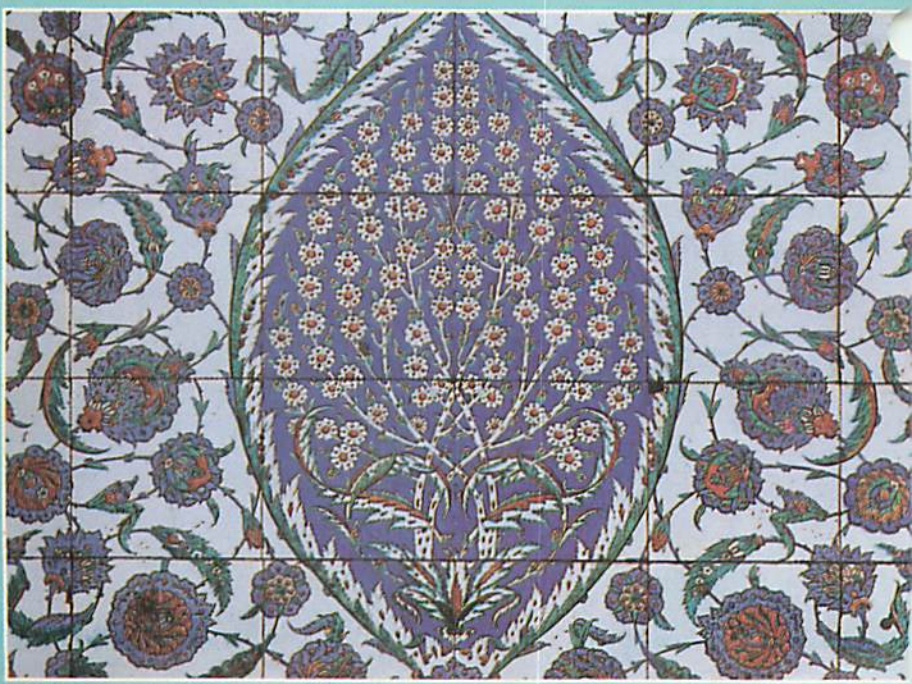

WOMAN BETWEEN ISLAM AND WESTERN SOCIETY

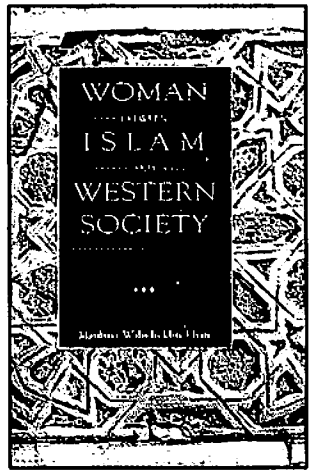

By Maulana Wahiduddin Khan

The status of woman in Islam is the same as that of man. Injunctions about honour and respect enjoined for one sex are enjoined equally for the other sex. So far as rights in this world and rewards in the Hereafter are concerned, there is no difference between the sexes. In the organization of daily living, both are equal participants and partners. Yet Islam sees man as man and woman as woman and, considering the natural differences, it advocates the principle of the division of labour between the two sexes rather than the equality of labour.

22 x 14.5 cm, 256 pages, ISBN 81-85063-75-3, Rs. 95

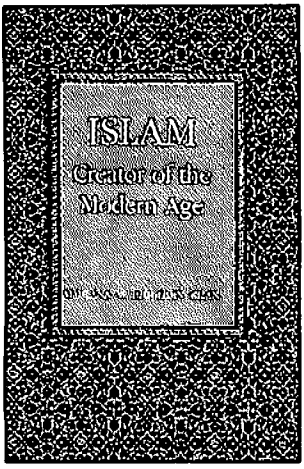

ISLAM: CREATOR OF THE MODERN AGE

By Maulana Wahiduddin Khan

Antiquity was an age of superstition: the present age is of science. Before reaching its present-day zenith, the modern, scientific age had to pass through three stages. The first was marked by the eradication of the superstitious mentality, the second saw the practical beginnings of scientific research; the third is the spectacular culmination of the scientific process in the second half of the twentieth century. The present volume examines the Islamic contribution to the completion of the first two stages during the millenium immediately followign upon the emergence of Islam.

22 x 14.5 cm, 125 pages, ISBN 81-85063-78-8, Rs. 65

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جون ۱۹۹۶، شمارہ ۲۳۵

غیر اثر پذیر	۴	سوال و جواب	۱۱
اجنبی دین	۵	سرسید فار مولا	۱۶
حسن تدبیر	۶	ایک دن	۲۱
قانون فطرت	۷	ایک انسانی کردار	۲۵
نصرت کا قانون	۸	ایک سفر	۲۶
زاویۂ نظر کا فرق	۹	خبرنامہ اسلامی مرکز-۱۰۷	۴۵
عورت، مرد	۱۰		

AL-RISALA (Urdu)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7. Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)
Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

غیر اثر پذیر

قرآن کی سورۃ نمبر ۴۸ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے یہ اصحاب رسول کی صفات ہیں۔ مگر وہ ایسی صفات ہیں جو آپ کے بعد بھی تبعاً تمام مسلمانوں سے مطلوب ہیں۔

ان صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ منکروں کے اوپر سخت ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے لیے رحم دل ہیں (اشداء علی الکفار رحماء بینھم) اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے باہمی تعلقات میں تو ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی کا سلوک کریں لیکن جب غیر قوموں کے ساتھ معاملہ پیش آئے تو وہ کڑے بن جائیں۔ ان کے معاملہ میں وہ متشددانہ سلوک اختیار کریں۔

اس آیت میں (اشداء علی الکفار) اسی معنی میں ہے جس کے لیے دوسری جگہ قرآن میں (اعزۃ علی الکافرین (المائدہ ۵۴) کے الفاظ آئے ہیں۔ عربی میں کہتے ہیں: ھو عزیز علیّ۔ یعنی وہ شخص ایسا مضبوط ہے کہ اس پر قابو پانا میرے لیے مشکل ہے۔ شدید کا مفہوم بھی یہی ہے۔ ابن منظور کی لسان العرب (۳/۳۵-۲۳۲) میں ہے کہ شدت کے اصل معنی صلابت کے ہیں۔ کوئی پتھریلی زمین جو پانی کا اثر قبول نہ کرے اس کو صلب کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مذکورہ آیت میں شدید کا لفظ غیر اثر پذیری کے معنی میں ہے۔ ابن منظور نے "شدید" کی تشریح کے تحت جاہلی دور کے شاعر کا یہ شعر نقل کیا ہے کہ میں کسی کی سخت بات کے مقابلہ میں نرم نہیں پڑتا، خواہ اس کی بات لوہے سے زیادہ سخت کیوں نہ ہو:

فانیّ لا الینُ لقول شدّتی ولو کانت اشدَّ من الحدید

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مذکورہ آیت میں اشداء کا لفظ داخلی معنی میں ہے نہ کہ خارجی معنی میں۔ یعنی اس میں اہل ایمان کی یہ داخلی صفت بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے گہرے یقین کی بنا پر ایسے ہو جاتے ہیں کہ وہ خارجی ترغیبات کا اثر قبول نہ کر سکیں۔ غیر خدا پرست اشخاص یا غیر خدا پرستانہ تہذیب کا سیلاب بھی اگر ان کے اوپر سے گزر جائے تو وہ پتھر اور لوہے کی طرح اس کا اثر قبول کرنے سے محفوظ رہیں گے ——— حق سے متاثر ہونے میں وہ انتہائی نرم ہوتے ہیں اور ناحق سے متاثر ہونے میں انتہائی سخت۔

اجنبی دین

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بدأ الاسلام غریباً و سیعود کما بدأ غریباً فطوبیٰ للغرباء (صحیح مسلم بشرح النووی ۲/۱۷۶) یعنی اسلام جب شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا۔ اور پہلے کی طرح دوبارہ وہ اجنبی ہو جائے گا۔ پس خوش خبری ہے اجنبیوں کے لیے۔

آغاز میں اسلام کس طرح اجنبی تھا۔ مکہ میں وہ امت ابراہیم میں ظاہر ہوا۔ مگر ان کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو پیغمبر ابراہیم سے منسوب تو کرتے تھے مگر عملاً وہ اپنے خود ساختہ بزرگوں کے دین پر قائم تھے۔ بظاہر وہ اپنے کو موحد سمجھتے تھے مگر انھوں نے وسیلہ اور شفاعت کا عقیدہ ایجاد کر کے بڑے خدا کے ساتھ بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا بنا لیے تھے۔ وہ خدا کی عبادت کے بھی مدعی تھے مگر خدا کی عبادت کے ساتھ انھوں نے بہت سی نئی نئی رسمیں بھی شامل کر لی تھیں۔ وغیرہ۔

ابتدائی دور کی اجنبیت کی اس مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بعد کے دور کی اجنبیت کیسی ہوگی۔ وہ دوبارہ یہ ہوگی کہ لوگ اپنے دین کو خدا اور رسولؐ سے لینے کے بجائے اپنے مزعومہ اکابر سے لینے لگیں گے۔ ان کے یہاں دین کی روح ختم ہو جائے گی البتہ دین کی صورت کی دھوم مزید اضافہ کے ساتھ جاری رہے گی۔ اسلام ان کی زندگی کا رہنما بننے کے بجائے ان کی قومی اور مادی زندگی کا ضمیمہ بن جائے گا۔ خدائی ہدایت کے الفاظ تو ان کے یہاں باقی رہیں گے مگر ہدایت الٰہی کی معنویت ان کے یہاں سے رخصت ہو جائے گی۔ خدا کا خوف اور آخرت کی تڑپ والا دین ان کے درمیان موجود نہ ہوگا، البتہ ظاہرداری والا دین خوب فروغ پائے گا۔

جب امت مسلمہ کا یہ حال ہوگا تو وہ سچے دین سے ناآشنا ہو جائے گی۔ اس کے سامنے جب دین کو اس کی اصل ابتدائی حالت میں پیش کیا جائے گا تو اس کو وہ ایک اجنبی دین معلوم ہوگا۔ وہ اسلام کے نام پر اسلام کا انکار کر دے گی۔ ایسے لوگ اپنے بنائے ہوئے دینی ڈھانچہ کو جانیں گے لیکن خدا اور رسولؐ کے دین کو پہچاننے کے لیے وہ عاجز ثابت ہوں گے۔

مبارک ہیں وہ لوگ جو اجنبیت کے دور میں خدا کے دین کو پہچانیں۔

حسن تدبیر

تاجر لوگ ایسا نہیں کرتے کہ وہ اپنا تجارتی کام شروع کر کے بیٹھ جائیں اور یہ سمجھ لیں کہ اب دوسروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ آئیں اور ہمارے یہاں سے اپنی مرضی کا سامان خرید کر لے جائیں۔ بلکہ اس کے بعد وہ ایک اور کام کرتے ہیں جس کو تجارت کو فروغ دینا کہا جاتا ہے۔ وہ اپنی تجارت کو ترقی اور فروغ دینے کے لیے مزید مختلف قسم کی کوششیں کرتے ہیں۔

انھیں میں سے ایک ہے ـــــ قیمت گھٹا کر سامان فروخت کرنا۔ مثلاً ایک شخص ایک پندرہ روزہ میگزین نکالے گا۔ اس کی اصل قیمت فی کاپی دس روپے ہوگی۔ مگر ایک مخصوص مدت تک وہ اس کی قیمت کم کر کے صرف دو روپیہ میں فروخت کرے گا۔ اس کمتر قیمت کو عام طور پر ترغیبی قیمت (invitation price) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص بازار میں ایک دکان کھولے گا۔ ابتدا میں وہ کچھ دنوں ایسا کرے گا کہ اس کا سامان جس کی اصل قیمت سو روپیہ ہے، اس کو وہ صرف ۵۰ روپیہ میں دے گا۔ اس کو افتتاحی رعایت (inaugural discount) کہا جاتا ہے۔

یہ طریقہ صرف تجارت کے لیے نہیں ہے۔ اس کا تعلق تمام اجتماعی معاملات سے ہے۔ جب بھی آپ کسی سے تعلقات بڑھانا چاہیں۔ کسی حلقہ میں نفوذ حاصل کرنا چاہیں۔ کسی کو اپنی طرف مائل کرنا چاہیں تو آپ کو یہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ دوسروں کو رعایت دے کر ہی اس دنیا میں دوسروں کے درمیان مقام حاصل ہوتا ہے۔

ہندستان میں بعض تاریخی یا غیر تاریخی اسباب سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے ہیں۔ اس کشیدگی کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اب دونوں فرقوں کے درمیان تعلق کو معتدل بنانے کی عملی صورت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان اس معاملہ میں پہل کر کے وہی تدبیر اختیار کریں جس کو مذکورہ مثال میں ترغیبی قیمت یا افتتاحی رعایت کہا گیا ہے۔

یہ کوئی دَبنے یا جھکنے کی بات نہیں۔ بلکہ وہ حسن تدبیر ہے۔ ذاتی معاملہ میں ہر آدمی اسی تدبیر کو اختیار کرتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ملّی معاملہ میں بھی اس کو اختیار کر لیا جائے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسری تدبیر موجودہ حالت کو ختم کرنے والی نہیں۔

قانون فطرت

۱۵ جنوری ۱۹۹۶ کو سہارن پور (امبیٹھہ) کے ڈاکٹر شاہد صابری سے ملاقات ہوئی۔ (Tel. 013292-5229) انھوں نے حکیم انور صاحب کے حوالے سے ایک واقعہ بتایا۔ حکیم انور صاحب کا مطب امبیٹھہ میں ہے۔ ان کا تعلق گنگوہ سے بھی ہے اور وہ اکثر وہاں جاتے رہتے ہیں۔

۱۹۹۱ کا واقعہ ہے جب کہ اتر پردیش میں رتھ یاترا کی دھوم تھی۔ حکیم انور صاحب گنگوہ کی ایک سڑک سے گزر رہے تھے۔ اس سڑک کے کنارے ایک صوفی کا مزار ہے جو باپڑی والے پیر کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی وقت ایک مقامی ہندو لالہ اشوک بھاردواج (دگر ولی روڈ، گنگوہ) وہاں سے گزرے۔ مزار کے پاس پہنچ کر وہ رکے۔ اپنے روایتی طریقہ کے مطابق، انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ لیے اور دیر تک ادب و احترام کے ساتھ مزار کے سامنے کھڑے رہے۔

لالہ اشوک بھاردواج کا تعلق آر ایس ایس سے ہے۔ حکیم انور صاحب کو یہ منظر دیکھ کر تعجب ہوا۔ آگے بڑھ کر انھوں نے ان سے کہا کہ لالہ جی، عام مسلمانوں کے تو آپ دشمن ہیں۔ مگر اس قبر والے کے سامنے آپ ہاتھ جوڑ رہے ہیں، حالاں کہ وہ بھی مسلمان تھے۔ لالہ اشوک بھاردواج نے جواب دیا: آپ بھی اس قبر والے مسلمان جیسے بن جائیے، ہم آپ کے لیے بھی ہاتھ جوڑنے لگیں گے۔

ہندوؤں کا یہ احترام صرف گنگوہ کے مدفون بزرگ کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام ہندستانی صوفیوں کے لیے ہے جس کا نمونہ جگہ جگہ ان کے مزاروں پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ صوفیوں اور موجودہ مسلمانوں میں وہ کون سا خاص فرق ہے کہ ہندو موجودہ مسلمانوں سے بیزار ہے اور عین اسی وقت وہ مسلم صوفیوں سے محبت کرتا ہے۔ اس کا بنیادی سبب صرف ایک ہے —— ان مسلم صوفیوں نے ہندو کے مقابلہ میں کبھی کوئی احتجاج یا مطالبہ نہیں کیا۔ جب کہ موجودہ مسلمان پچھلے پچاس سال سے اپنے نااہل لیڈروں کی رہ نمائی میں ہندوؤں سے احتجاج اور مطالبہ کی مہم جاری کیے ہوئے ہیں۔

بے نیازی اور قناعت کرنے والے کے آگے لوگ جھکتے ہیں اور شکایت اور مطالبہ کرنے والوں سے لوگ بیزار ہو جاتے ہیں۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور فطرت کے قانون میں کوئی استثناء نہیں۔

نصرت کا قانون

قرآن میں ایک طرف توکل علی اللہ کی تعلیم دی گئی ہے (الاحزاب ۳) اور دوسری طرف فرمایا کہ خذوا حذرکم (النساء ۷۱) پہلی آیت کو اگر مطلق معنوں میں لیا جائے تو مومن کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ ہر معاملہ میں خدا پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائے۔ کیوں کہ جب اصل حقیقت یہ ہو کہ جو کچھ ہوتا ہے، خدا کے کیے سے ہوتا ہے تو اس کے بعد انسان کی اپنی تدبیر ایک غیر ضروری چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ بلکہ وہ اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ آدمی کو خدا کی مدد پر پورا بھروسہ نہیں۔

اسی طرح دوسری آیت کو اگر اس کے لفظی اور ظاہری مفہوم کے اعتبار سے لیا جائے تو مومن کو بھی ٹھیک ویسے ہی اپنے بچاؤ کی یا اپنے معاملات کو درست کرنے کی تدبیر کرنا چاہیے جیسے کہ عام دنیادار لوگ کرتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت کو اگر اس کے پورے مفہوم میں لیا جائے تو دوسری آیت غیر متعلق ہے۔ اور اگر دوسری آیت کو اس کے پورے مفہوم میں لیا جائے تو پہلی آیت کی مطابقت دوسری آیت کے ساتھ ناقابل فہم نظر آنے لگتی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ یہ ایک ہی معاملہ کے دو پہلو ہیں۔ توکل علی اللہ کی آیت خدا کی نسبت سے ہے اور خذوا حذرکم کی آیت بندے کی نسبت سے۔

اصل یہ ہے کہ دنیا میں خدا کی جو مدد آتی ہے، وہ ہمیشہ اسباب کے پردے میں آتی ہے۔ اسباب کا پردہ ہٹا کر براہ راست انداز میں خدا کی مدد کبھی نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو اپنی استطاعت کے مطابق پوری تدبیر کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ تدبیر نہ کرے تو گویا اس نے وہ حالات ہی فراہم نہیں کیے جس کے قالب میں اس کے لیے خدا کی مدد اترتی۔

یہ دو طرفہ عقیدہ آدمی کے اندر بے پناہ اعتماد پیدا کر دیتا ہے۔ ایک طرف وہ تدبیر میں کمی نہیں کرتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ خدا کی مدد جب بھی آئے گی تدبیر ہی کے اندر سے آئے گی۔ دوسری طرف اس کو اپنی کامیابی کا بے پناہ یقین ہوتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ جب میں نے تدبیر کی شرط پوری کر دی تو خدا کی طرف سے آنے والی مدد بھی ضرور آکر رہے گی۔

مومن کوشش کے معاملہ میں مجاہد ہوتا ہے اور نتیجہ کے معاملہ میں متوکل۔

زاویۂ نظر کا فرق

سورہ البقرہ (رکوع ۳۲) میں بنی اسرائیل کی قدیم تاریخ کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے تقریباً تین سو سال بعد، اور حضرت داؤد سے کچھ پہلے، ان کے ایک نبی شموئیل (۱۰۲۰ - ۱۱۰۰ ق م) تھے جو شام کے ایک شہر رامہ میں رہتے تھے۔ بنی اسرائیل اس وقت دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لیے ایک ملک (بادشاہ) مقرر کر دیجئے۔ شموئیل جو اس وقت بوڑھے ہو چکے تھے، انھوں نے کہا کہ اللہ نے طالوت (Saul) کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے (البقرہ ۲۴۷)

اس کے بعد قرآن میں ہے کہ بنی اسرائیل نے کہا کہ اس کو ہمارے اوپر بادشاہی کیسے مل سکتی ہے۔ حالاں کہ اس کے مقابلہ میں ہم بادشاہی کے زیادہ حق دار ہیں، اور اس کو زیادہ دولت بھی حاصل نہیں۔ نبی نے کہا کہ اللہ نے تمہارے مقابلہ میں اس کو چنا ہے اور علم اور جسم میں اس کو زیادتی دی ہے۔ اور اللہ اپنی سلطنت جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا، جاننے والا ہے (البقرہ ۲۴۷)

سموئیل نبی نے جس آدمی کو بنی اسرائیل کے اوپر سردار مقرر کیا، اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ اونچے خاندان کا نہیں تھا اور اس کے پاس زیادہ دولت بھی نہیں تھی، بنی اسرائیل نے جب اس کو اس اعتبار سے دیکھا تو وہ ان کے درمیان ایک کم تر انسان نظر آیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا ایک کم تر انسان ہمارے اوپر سردار کس طرح بن سکتا ہے۔ مگر اس کی شخصیت کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ جسمانی اعتبار سے ایک طاقت ور انسان تھا اور اسی کے ساتھ ذہین اور مدبر تھا۔ اس دوسرے پہلو سے دیکھنے میں وہ سب سے زیادہ لائق تھا۔ کیوں کہ سرداری کے لیے اسی قسم کی صلاحیت والے انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ زاویۂ نظر کے فرق کا معاملہ ہے۔ کسی چیز کو آپ ایک رخ سے دیکھیں تو وہ درست نظر آئے گی۔ اسی چیز کو دوسرے رخ سے دیکھئے تو وہ بالکل غلط معلوم ہونے لگے گی۔

یہی اس دنیا میں انسان کا امتحان ہے۔ یہاں صحیح زاویۂ نظر والا آدمی ہدایت پائے گا، اور غلط زاویۂ نظر والا آدمی بے راہ ہو کر رہ جائے گا۔

عورت ، مرد

اسلام کے مطابق ، عورت اور مرد یکساں درجہ میں عزت اور تکریم کے مستحق ہیں۔ قرآن (آل عمران ۱۹۵) میں فرمایا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا ، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تم آپس میں ایک دوسرے کا جزء ہو (You are members, one of another)

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرد کی طہارت کا مسئلہ دریافت کیا گیا۔ آپ نے مسئلہ بیان کیا تو ایک عورت نے پوچھا : (المرأة ترى ذلك أعليها غسل۔ یعنی عورت کے ساتھ بھی ایسا ہی پیش آئے تو کیا اس پر غسل ہے۔ آپ نے جواب دیا :

نعم، إنما النساء شقائق الرجال ہاں، عورتیں مردوں کا نصف ثانی ہیں۔

(سنن ابی داؤد ، کتاب الطہارۃ ، صفحہ ٦٠)

شقیق یا شقیقہ کے معنی ہیں دو برابر کے حصوں میں بٹی ہوئی چیز کا آدھا حصہ۔ اسی لیے بھائی کو شقیق اور بہن کو شقیقہ کہتے ہیں۔ اس حدیث کا صحیح ترجمہ یہی ہے کہ عورتیں مردوں کا دوسرا نصف ہیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ عورت مرد کی شریک حیات ہے ، اور اسی طرح مرد عورت کا شریک حیات۔ دونوں یکساں طور پر ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔

کسی ایک فرد کے اندر تمام مطلوب صفات نہیں ہو سکتیں ، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صفات انسانی کو دو ہستیوں میں بانٹ دیا ہے۔ عورت کے اندر نرمی والی صفات رکھ دیں تاکہ وہ مرد کے لیے سکون کا باعث ہو (الروم ۲۱) اور دوسری طرف مرد کے اندر قوامیت والی صفات رکھ دیں تاکہ عورت اس سے اعتماد حاصل کر سکے (النساء ۳۴)

صفات کے اس فرق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر حالات میں دونوں کا میدان کار الگ الگ ہو جاتا ہے۔ اس علحدگی کا مزید فائدہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بہترین مشیر بن جاتے ہیں۔ اپنے دائرہ کار کے اعتبار سے ان میں کا ایک جن باتوں کے درمیان گھرا ہوا ہوتا ہے ، دوسرا اس سے غیر متعلق رہ کر آزادانہ طور پر سوچنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس طرح دونوں کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ جب ان میں کا ایک متاثر ذہن کے تحت سوچے تو ان میں کا دوسرا غیر متاثر ذہن کے تحت اس کی رہنمائی کر سکے۔

سوال وجواب

ڈکٹور عبد الحلیم عویس (قاہرہ) کی طرف سے راقم الحروف کو ایک سوال نامہ موصول ہوا۔ سوالات کا تعلق موجودہ زمانہ میں اسلام کی معنویت اور اسلامی نظام کے قیام کے امکانات وغیرہ سے تھا۔ اصلاً یہ سوال نامہ تقریباً ۳۰ سال پہلے ایک مسیحی تنظیم نے تیار کیا اور عرب دنیا کے ان ادیبوں اور دانشوروں سے ان کے جوابات طلب کیے جو اپنے لادینی اور اشتراکی رجحانات کے لیے مشہور تھے۔ یہ جوابات، پیشگی اندازہ کے مطابق، اسلام کے خلاف تھے۔ چنانچہ ان کو شائع کر کے یہ پروپگنڈہ کیا گیا کہ اسلام خود مسلم اہل فکر کی نظر میں ایک تاریخی یادگار یا ایک شخصی عقیدہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اب انسانیت کو مزید کچھ دینے کے لیے اسلام کے پاس کچھ نہیں۔ وہ دور قدیم کی ایک چیز بن چکا ہے وغیرہ۔

سوال نامہ کے ساتھ ڈکٹور عبد الحلیم عویس نے مذکورہ جوابات کا خلاصہ بھی ارسال کیا تھا اور اپنے کورنگ لیٹر میں یہ گزارش کی تھی کہ ان سوالات کا جواب اتنے مفصل اور مدلل انداز میں تحریر کروں جس سے بالواسطہ طور پر اس گمراہ کن پروپگنڈہ کی موثر علمی تردید بھی ہو جائے۔ ذیل میں اصل سوالات اور ان کے جوابات کا اُردو ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

الأسئلة:

١. هل يحافظ الإسلام حتى يومنا هذا على دعوته الشاملة؟

٢. هل يمكن لدولة عصرية إعتماد الإسلام نظام حكم؟

٣. هل النظام الإسلامي للحكم مرحلة حتمية على الشعوب العربية أن تمر بها في معرض تطورها؟

٤. هل تأخذ ظاهرة اليقظة الدينية التي برزت في السنوات العشر الماضية منحىً إيجابياً؟

٥. من هو العدو الأول للإسلام حالياً؟

سوالات کا ترجمہ

۱۔ کیا اسلام آج بھی اپنی ہمہ گیر دعوت کو بدستور برقرار رکھے ہوئے ہے؟

۲۔ کیا موجودہ زمانہ میں کوئی ملک اسلام کو ایک نظام حکومت کے طور پر قبول کر سکتا ہے؟

۳۔ کیا اسلامی نظام کوئی ایسا حتمی مرحلہ ہے جس سے عرب قوموں کو اپنے ارتقاء کے دوران گزرنا بالکل ناگزیر ہے؟

۴- کیا دینی بیداری کا یہ ظاہرہ جو گزشتہ دس برسوں میں سامنے آیا ہے کوئی مثبت رخ اختیار کرے گا؟

۵- اس وقت اسلام کا دشمن نمبر ایک کون ہے؟

جوابات

۱- میرا جواب یہ ہے کہ ہاں۔ اسلام کی ہمہ گیر معنویت اور حیات انسانی کے ساتھ اس کی مطابقت (relevance) آج بھی اسی طرح باقی ہے جس طرح وہ ہزار سال پہلے کے دور میں پائی جاتی تھی۔ حتی کہ وہ دور جس کو دور جدید کہا جاتا ہے، وہ خود اسلام کا پیدا کردہ ہے، پھر اسلام خود اپنی پیدا کردہ دنیا کے لیے غیر مطابق کیسے ہو سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کی تمام اعلیٰ قدریں، مثلاً فکری آزادی، انسانی برابری، جمہوریت، جدید ٹکنالوجی، وغیرہ سب اسلام ہی کے انقلاب کے سیکولر نتائج ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب: "اسلام دور جدید کا خالق"

بعض امور جس میں اسلام کو عہد حاضر کے غیر مطابق بتایا گیا وہ خود بتانے والوں کی غلطی تھی مثلاً عورت اور مرد کے ورک پلیس کو اسلام میں الگ الگ رکھا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں اس تصور کو رد کر دیا گیا۔ مگر اسی صدی کے نصف آخر میں حیاتیات اور نفسیات کے گہرے مطالعہ نے ثابت کیا کہ عورت اور مرد کے درمیان فیصلہ کن قسم کا تخلیقی فرق ہے۔ اور جب دونوں میں خود تخلیق کے اعتبار سے فرق ہو تو دونوں کے ورک پلیس کا جدا جدا ہونا ہی مطابق فطرت ہے نہ کہ اس کا ایک ہونا۔ چوں کہ یہ ایک فطری حقیقت ہے، اس لیے خود مغربی سوسائٹی میں، کامل آزادی کے باوجود، ورک پلیس کی یہ تفریق آج بھی پوری طرح باقی ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: خاتون اسلام)

۲- اسلام کو بطور نظام حکومت اختیار کرنا بلاشبہ عین ممکن ہے۔ کوئی حقیقی نظریاتی رکاوٹ اس میں حائل نہیں۔ مثال کے طور پر موجودہ زمانہ میں جمہوریت کو معیاری حکومتی نظام سمجھا جاتا ہے۔ اس جمہوری نظام کو اسلام ہی نے تاریخ میں پہلی بار پیدا کیا۔ وہ اسلام میں شورائی نظام کے نام سے موجود ہے۔ ایسی حالت میں اسلام پر مبنی سیاسی نظام ناقابل عمل کیوں ہوگا۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، صرف ایک چیز ہے جس کی بنا پر جدید مفکرین اسلام کے سیاسی نظام کو عہد حاضر کے لیے غیر صالح سمجھتے ہیں۔ وہ یہ کہ، ان کے نزدیک، اسلام کلیت پسندانہ نظام (totalitarianism) کا حامی ہے۔ اس بنا پر وہ کسی مشترک سماج (plural society) کے لیے پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ صرف ایک غلط فہمی ہے جو کچھ نا اہل نمائندگان اسلام کی غلط تشریح سے پیدا ہوئی ہے۔ ان حضرات نے یہ کہنا شروع کیا کہ اسلام ایک دین کامل ہے جس کے اجزاء کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے نزدیک اس نظام کو بیک وقت پوری صورت میں قائم ہونا چاہیے۔ اس کے حصے بخرے کرنا کسی حال میں ممکن نہیں۔

یہ ایک غلط تصور ہے۔ بطور عقیدہ بلاشبہ اسلام دین اور ریاست دونوں ہے۔ مگر عملی نفاذ کے اعتبار سے دونوں کا معاملہ الگ الگ ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے حج اور زکوٰۃ بطور عقیدہ فرض ہے۔ مگر ان پر عمل اس وقت کیا جائے گا جب کہ اس کی شرائط بھی پائی جا رہی ہوں۔

اس معاملہ میں ہمیں مدنی دور سے رہنمائی ملتی ہے۔ مدنی دور اسلام کا حکومتی دور ہے، مگر اس حکومت کے خود دو دور ہیں۔ مدنی دور کے نصف اول میں وہاں مشترک آبادی تھی۔ گویا وہی چیز جس کو موجودہ زمانہ میں پلورل سوسائٹی کہا جاتا ہے۔ اور مدنی دور کے نصف آخر میں وہاں وحدانی معاشرہ وجود میں آگیا۔

ان دونوں دوروں میں دو الگ الگ انداز اختیار کیا گیا۔ مدینہ جب ایک پلورل سوسائٹی تھا تو وہاں اسلامی اقتدار کے باوجود غیر مسلموں کو ان کے اپنے رواج پر چھوڑ دیا گیا:

کتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاباً (فی المدینۃ) بین المہاجرین والانصار وادع فیہ الیہود وعاہدھم واقرھم علی دینھم واموالھم (البدایۃ والنہایۃ ۳/۲۲۴)

کسی پلورل سوسائٹی کے لیے مدنی دور کے نصف اول میں مثال موجود ہے۔ یہ غیر مسلموں کے لیے تقریباً وہی چیز ہے جو موجودہ زمانہ میں سیکولر سسٹم میں اختیار کی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پلورل سوسائٹی میں بھی اسلام اتنا ہی قابل عمل ہے جتنا کہ سیکولر نظام کو قابل عمل سمجھا جاتا ہے۔

۳- میں سمجھتا ہوں کہ عرب ترقی کے لیے ایسا ہونا ضروری ہے۔ تاریخی طور پر عربوں کا جو مزاج بنا ہے اس میں کوئی دوسرا نظام ان کے یہاں معقول طور پر کام نہیں کر سکتا۔ جمہوری طور پر ان کے درمیان صرف اسلام کا نظام ہی قابل قبول ہو سکتا ہے۔ دوسرا کوئی نظام جب بھی ان کے درمیان قائم ہوگا وہ آمریت کے زور پر قائم ہوگا۔ اور آمریت ہمیشہ ترقی کے عمل کو روکنے کی قیمت پر قائم ہوتی ہے۔ ترقی کے لیے آزادی ضروری ہے۔ اور آمریت کا نظام اس کا متحمل نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو فکر و عمل کی آزادی عطا کرے۔

عرب دنیا میں بظاہر جس چیز نے اسلام کو ناقابل عمل بنایا وہ کچھ مسلم لیڈروں اور مسلم تحریکوں کا غیر جمہوری مزاج ہے۔ جمہوری مزاج یہ ہے کہ آزادانہ اور منصفانہ (free and fair) الکشن ہو۔ اور پھر جو جیتے اس کو مقررہ مدت تک کے لیے حکومت چلانے کا موقع دیا جائے۔ اور جو ہارے وہ اپنی ہار کو تسلیم کرلے۔

عرب ملکوں میں یہ مزاج موجود نہیں۔ یہاں الکشن میں ہارا ہوا گروپ اپنی ہار کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور جو جیتے وہ چاہتا ہے کہ حکومت ہمیشہ اسی کے پاس رہے۔ اگر اس مزاج کی اصلاح ہو جائے تو عرب ملکوں میں اسلام پوری طرح قابل عمل نظر آنے لگے گا۔

۴۔ وہ ظاہرہ جس کو موجودہ زمانہ میں دینی بیداری کہا جاتا ہے، وہ میرے نزدیک صرف قومی بیداری ہے۔ دینی بیداری وہ ہے جو معرفت خداوندی کی سطح پر ہونے والے ذہنی انقلاب سے ابھرے۔ موجودہ مسلم بیداری کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ وہ فلسطین اور اسی قسم کے دوسرے محاذوں پر مسلمانوں کی قومی شکست کی زمین سے ابھری ہے۔ وہ ایک قومی ردعمل ہے جس کو اسلام کی اصطلاحوں میں بیان کیا جاتا ہے۔

دینی بیداری لوگوں کے اندر عجز پیدا کرتی ہے اور قومی بیداری احساس برتری کا جذبہ ابھارتی ہے۔ دینی بیداری سے دعوت کی نفسیات پیدا ہوتی ہے اور قومی بیداری سے مخاصمت کی نفسیات۔ دینی بیداری آدمی کو دوسروں کے تئیں محبت کرنے والا بناتی ہے اور قومی بیداری دوسروں کے تئیں نفرت کرنے والا۔ دینی بیداری میں لوگوں کی نظر اپنی ذمہ داریوں پر ہوتی ہے اور قومی بیداری میں لوگوں کی نظر اپنے حقوق پر۔ دینی بیداری سے آخرت رخی ذہن بنتا ہے اور قومی بیداری سے دنیا رخی ذہن۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی موجودہ بیداری میں وہی تمام علامتیں نظر آئیں گی جن کو ہم نے اوپر کی تقسیم میں قومی بیداری کے تحت بیان کیا ہے۔

۵۔ قرآن کی تصریح کے مطابق، اسلام کا دشمن نمبر ایک کبھی خارج میں نہیں ہو سکتا۔ اس کو یقینی طور پر داخل میں تلاش کرنا چاہیے (فلا تخشوهم واخشون) میرے نزدیک یہ داخلی دشمن وہ نام نہاد اسلام پسند (اسلامسٹ) ہیں جو موجودہ زمانہ میں "اسلامی نظام قائم کرو" کا نعرہ لے کر کھڑے

ہو گئے اور ہر جگہ ملکی حکومتوں سے ٹکرا رہے ہیں۔

اسلامی نظام ہمیشہ اس وقت قائم ہوتا ہے جب اس کے لیے عوامی سطح پر موافق ماحول بنایا جا چکا ہو (ملاحظہ ہو حضرت عائشہؓ کی روایت، البخاری، باب تالیف القرآن) موجودہ اسلام پسند حالات کو سازگار بنائے بغیر اقتدار پر قبضہ کر کے اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، اس لیے اسلام تو قائم نہیں ہو رہا ہے۔ البتہ ہر جگہ ضد اور نفرت بھڑک رہی ہے۔ ہر جگہ اسلام سے بیزاری پیدا ہو رہی ہے۔

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ: سأل رجل علیا رضی اللہ عنہ ما بال المسلمین، اختلفوا علیك ولم یختلفوا علی ابی بکر وعمر۔ فقال لأن ابا بکر وعمر کانا والیین علی مثلی وانا الیوم والٍ علی مثلك (صفحہ ۲۱۱)

خلیفہ چہارم کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک صحابیٔ رسولؐ حاکم ریاست ہو تب بھی اجتماعی نظام کو درست طور پر چلانے کے لیے ضروری ہے کہ امثال علیؓ کثرت سے معاشرہ کے اندر موجود ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو صحابی جیسے ایک شخص کے حاکم ہونے کے باوجود سارا نظام منتشر ہو جائے گا۔

موجودہ زمانہ میں جن مسلم ملکوں میں "اسلامی حکومت قائم کرو" کے نعرے لگائے جا رہے ہیں وہاں نہ حکومت کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کوئی مثل عمرؓ موجود ہے اور نہ معاشرہ میں امثال علیؓ نظر آتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر سیاسی تبدیلی ہو بھی جائے تو کوئی صالح اسلامی نظام کیسے قائم ہوگا۔ جب کہ حضرت علیؓ کے زمانہ سے بھی زیادہ بگاڑ آج پیدا ہو چکا ہے۔

جو لوگ اس قسم کی غیر فطری اور غیر اسلامی تحریکیں چلا رہے ہیں، وہ بلاشبہ اسلام کے دشمن ہیں کیوں کہ انھوں نے اسلام کو ساری دنیا میں بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ لوگوں کو موقع دے رہے ہیں کہ وہ اسلام کو ناقابل عمل، غیر مہذب، تشدد پسند، رجعت پسند قرار دے دیں۔

سرسید فارمولا

سرسید احمد خاں برٹش دور حکومت میں ۱۸۱۷ میں پیدا ہوئے، اور اسی زمانہ میں ۱۸۹۸ میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے سو سال بعد چھپنے والی ایک انسائیکلوپیڈیا میں ان کے بارہ میں یہ الفاظ لکھے گئے ہیں ــــــ سرسید احمد خاں، انیسویں صدی میں انڈیا کے سب سے بڑے مسلم لیڈر:

Sir Sayyid Ahmad Khan, India's greatest 19th century Muslim leader, (9/414).

آج مسلمانوں کے ہر طبقہ میں سرسید احمد خاں کو پسند کیا جاتا ہے۔ باریش گروہ اور بے ریش گروہ دونوں ہی یکساں طور پر سرسید کے قصیدہ خواں ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی تعلیم گاہ کو ملک میں حیات ملی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ آج سب ان کے کارناموں کا کھلے دل سے اعتراف کر رہے ہیں۔ کوئی ان کو سید والا گہر کے نام سے یاد کرتا ہے۔ کوئی ان کو معمار قوم کا لقب دے رہا ہے۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ اگر سرسید نہ ہوتے تو مسلمان آج آزاد ہندستان کے ہریجن ہوتے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مگر انھیں سرسید کو اپنے زمانہ میں کافر، ملت فروش اور دشمنان اسلام کا ایجنٹ کہا گیا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے سرسید کا ساتھ دیا اور ان کے بارہ میں کتابیں لکھیں تو اکبر الہ آبادی نے دونوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا:

سید کی داستان کو حالی سے پوچھئے غازی میاں کا حال ڈفالی سے پوچھئے

قدیم وجدید میں اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب سادہ طور پر یہ ہے کہ آج کے مداحین سرسید کو ان کے مستقبل میں دیکھتے ہیں۔ اور ماضی کے ناقدین سرسید کو ان کے حال میں دیکھ رہے تھے۔

ہر مصلح ہمیشہ اسی طرح دو طرفہ انجام سے دوچار ہوا ہے۔ ہر انقلابی مصلح کو اس کے معاصرین کی طرف سے سخت مخالفتوں کا سامنا پیش آیا۔ مگر بعد کے زمانہ میں جب اس کی اصلاحی

کوششوں کے نتائج سامنے آجاتے ہیں تو بعد کے لوگ اس کے قصیدہ خواں بن جاتے ہیں۔ ہر مصلح اس دنیا میں انسانوں کی اسی کوتاہ نظری کا شکار ہوا ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ مظہر اتنا عام ہے کہ پیغمبر جیسی مقدس ہستیاں بھی اس عمومی انجام سے مستثنیٰ نہیں۔

حقیقی لیڈر کی تعریف یہ ہے کہ وہ حال میں مستقبل کو دیکھ سکے۔ ایسا لیڈر جو بات کہتا ہے وہ مستقبل کے لحاظ سے کہتا ہے۔ وہ ایسا منصوبہ پیش کرتا ہے جس کا مثبت انجام بہت بعد کو نکلنے والا ہوتا ہے۔ اب جن لوگوں کی نظریں حال میں اٹکی ہوئی ہوتی ہیں، جو ظاہری مسائل کو جانتے ہیں مگر ان کی تہہ میں چھپے ہوئے امکانات سے باخبر نہیں ہوتے، ایسے لوگ صرف سطحی لیڈروں کو سمجھ پاتے ہیں جو انھیں سامنے کے مسائل میں الجھائیں۔ وہ ان سچے لیڈروں کی اہمیت کو جان نہیں پاتے جو مستقبل کی تعمیر کا گہرا نقشہ ان کے سامنے پیش کریں۔ یہی معاملہ سرسید احمد خاں کے ساتھ پیش آیا۔

سرسید احمد خاں کا زمانہ وہ ہے جب کہ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ ہمارے تمام اکابر اس زمانہ کو غلامی کا زمانہ کہتے تھے۔ مولانا قاسم نانوتوی، مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، غرض اس دور کے جتنے بھی رہنما تھے، سب کے سب نفرت کی حد تک انگریزوں کے مخالف بنے ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک انگریزی حکومت کی موجودگی میں مسلمانوں کے لئے کسی ترقی یا کامیابی کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ مولانا محمد علی تو غلام ہندستان میں مرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ اقبال نے اس سے آگے بڑھ کر کہا کہ غلامی ایسی بری چیز ہے کہ وہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہی کو ابدی طور پر لوگوں سے چھین لیتی ہے:

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

مگر سرسید کا معاملہ یہ تھا کہ وہی انگریز جس کو تمام لوگ دشمن اسلام کے خانہ میں ڈالے ہوئے تھے، اسی انگریز میں انھوں نے دوستی کے پہلو تلاش کر لئے۔ وہی ہندستان جس کو لکھنے اور بولنے والے مسلمانوں کا پورا طبقہ صرف غلام ہندستان بتا رہا تھا، اسی غلام

ہندستان میں انھوں نے آزادی کے مواقع کی نشاندہی کی۔ سرسید کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مسدس میں کہا:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے کہ جو کچھ ہے دینا میں تعلیم ہی ہے

غلامی کے اندر آزادی کی اس نشاندہی کا مطلب کیا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندستان میں اگرچہ انگریزوں کی سیاسی محکومی کا مسئلہ ہے، مگر عین اسی وقت یہاں تعلیمی اور اقتصادی آزادی بھی موجود ہے۔ سیاسی مسئلہ کے باوجود اس ملک میں تمہارے لئے یہ موقع ہے کہ تم غیر سیاسی میدانوں میں محنت کرکے اپنے لئے ایک باعزت اور خوش حال زندگی بنا سکو۔

دوسرے لفظوں میں، سرسید کے مخالفین صرف مسئلہ انگریز کو دیکھ رہے تھے، وہ اسی مسئلہ کو سب کچھ سمجھ کر اس سے لڑنے کی باتیں کرتے تھے، کیوں کہ ان کے نزدیک جب تک انگریز کا سیاسی مسئلہ ختم نہ ہو کوئی ترقیاتی کام سرے سے کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن سرسید کی گہری نگاہ نے دیکھا کہ یہاں اگر مسائل ہیں تو اسی کے ساتھ اور عین اسی وقت یہاں مواقع بھی موجود ہیں۔ قانون فطرت کی زبان میں انھوں نے لوگوں کو یہ فارمولا دیا کہ ـــــ مسائل کو نظر انداز کرو، اور مواقع کو استعمال کرکے اپنی زندگی کی تعمیر کرو۔

سرسید کے زمانہ میں اس فارمولے کی حکمت آنکھ والوں کو بھی نظر نہیں آتی تھی۔ مگر سو سال کے تجربہ کے بعد آج بے آنکھ والے بھی دیکھ رہے ہیں کہ سرسید کی نشاندہی نہایت درست تھی۔ اپنے حال میں بظاہر سرسید کا فارمولا بزدلی اور بے عملی نظر آتا تھا۔ مگر بعد کے نتیجہ نے بتایا کہ وہ عین حکمت اور سراپا عمل تھا۔ بلکہ وہ واحد ممکن تدبیر تھی۔ اور اگر اول مرحلہ میں اس تدبیر کو پوری طرح اختیار کر لیا جاتا تو یقیناً مسلمانوں کی حالت اس سے بہت زیادہ مختلف ہوتی جو آج ہر طرف دکھائی دے رہی ہے۔

مگر انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ ماضی سے بہت کم سبق لیتا ہے۔ چنانچہ آج دوبارہ ہر طرف اسی کوتاہ بینی کا دور دورہ ہے جو سرسید کے زمانہ میں یہاں پائی جاتی تھی۔ لوگ

ماضی کے سرسید کے قصیدہ خواں ہیں لیکن حال میں اگر کوئی خدا کا بندہ سرسید کے فارمولے کو منطبق کرنے والی بات کرے تو دوبارہ اسی طرح وہ اس کے دشمن بن جاتے ہیں جس طرح ماضی میں وہ سرسید کے دشمن بنے ہوئے تھے۔

اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ وہ مقابلہ اور مسابقت کی دنیا ہے۔ اس مقابلہ اور مسابقت کے ماحول کی وجہ سے یہاں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان زندگی کی دوڑ جاری رہتی ہے۔ کبھی کوئی آگے بڑھ جاتا ہے اور کبھی کوئی پیچھے رہ جاتا ہے۔ یہ صورت حال ہابیل اور قابیل کے زمانہ سے ہے اور وہ قیامت تک اسی طرح جاری رہے گی۔ یہ نظام خود خدا کا قائم کیا ہوا ہے، اور کسی بھی حال میں اس میں کوئی تبدیلی ہونے والی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا کبھی اور کسی کے لئے بھی ایسی نہیں ہو سکتی کہ اس کے لئے سب کچھ اچھا ہو اور کوئی ناخوشگوار چیز سرے سے یہاں موجود نہ ہو۔

تاہم اس دنیا کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں یہاں ایک نہ بدلنے والی صورت حال بھی ہمیشہ باقی رہے۔ وہ یہ کہ سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے دوران جب ایک گروہ کو پیچھے دھکیلا جائے تو عین اسی وقت خود حالات کے تقاضے کے تحت اس کے لئے نئے امکانات بھی ظاہر ہو جائیں۔ چھیننے والا جب اس سے ایک زینہ چھینے تو فطرت کا قانون اس کے لئے ایک اور راستہ کھول دے جس کے ذریعہ چل کر وہ دوبارہ آگے جا سکتا ہو۔

۱۹۴۷ سے پہلے جب ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ تب بھی یہاں یہی صورت حال قائم تھی، آج جب کہ یہاں "اکثریتی فرقہ" کا غلبہ ہے تب بھی یہی حالت یہاں موجود ہے پچاس سال پہلے جب برصغیر ہند ایک تھا تب بھی یہی حالت تھی، آج جب کہ برصغیر کے تین ٹکڑے ہو گئے ہیں تب بھی تینوں جگہ یہی حال ہے۔ ہر جگہ کچھ نئے یا پرانے مسائل ہیں، اور اسی طرح ہر جگہ کچھ نئے یا پرانے مواقع بھی۔

آپ خواہ یورپ اور امریکہ جائیں یا عرب دیشوں اور مسلم دیشوں میں جائیں، ہر جگہ آپ کو ظاہری فرق کے ساتھ عین یہی صورت حال ملے گی۔ یہ فطرت کا قانون ہے،

اور فطرت کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس قانون میں نہ زمانہ کے فرق سے کوئی فرق واقع ہوتا اور نہ جگہ کے فرق سے کوئی فرق۔

ایسی حالت میں کرنے کا کام کیا ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ حالات کے خلاف چیخ پکار کرنے کے بجائے حالات کا سنجیدہ مطالعہ کیا جائے۔ حالات کے خلاف ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے حالات کے ساتھ ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ سرسید کا مذکورہ بالا فارمولا دراصل اسی ہم آہنگی کے طریقہ کا دوسرا نام ہے۔

یہ دنیا جب مقابلہ اور مسابقت کی دنیا ہے تو یقینی طور پر وہ کبھی مسائل سے خالی بھی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جس طرح دوسرے تمام زمانوں میں مسائل موجود تھے، اسی طرح آج بھی یہاں مسائل موجود ہیں۔ یہ مسائل نظام فطرت کی بنا پر ہیں نہ کہ کسی کے ظلم اور تعصب کی بنا پر۔ تاہم خود فطرت ہی کا بنایا ہوا نظام یہ بھی ہے کہ جب بھی دنیا میں مسائل ہوں تو عین اسی وقت وہاں مواقع بھی موجود ہوں۔ ایسی حالت میں عقل و حکمت کا تقاضا صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ مسائل کو نظر انداز کیا جائے اور مواقع کو دریافت کر کے انھیں استعمال کیا جائے:

Ignore the problems, avail the opportunities.

اس دنیا میں کامیابی کا یہی واحد فارمولا ہے۔ جب بھی کسی شخص یا گروہ نے اس دنیا میں کامیابی حاصل کی ہے تو اسی فارمولے پر چل کر کامیابی حاصل کی ہے۔ آئندہ بھی جو لوگ اس دنیا میں کوئی کامیابی حاصل کریں گے تو وہ بھی اسی فارمولے پر چل کر حاصل کریں گے۔ مسائل سے لڑنے والے لوگ اس دنیا میں ہمیشہ ناکام ہوتے ہیں۔ اور مواقع کو استعمال کرنے والے لوگ ہمیشہ کامیاب۔ اس کے سوا اس دنیا میں کامیابی کی کوئی بھی دوسری تدبیر نہیں۔ نہ ہندستان میں اور نہ کسی دوسرے ملک میں۔ نہ آج اور نہ آج کے سیکڑوں سال بعد۔

ایک دن

۱۸ فروری ۱۹۹۶ کو رمضان ۱۴۱۶ھ کی ۲۸ تاریخ تھی۔ راقم الحروف کی دعوت پر آج دہلی کے تین اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو افطار میں ہمارے ساتھ شریک ہوئے۔ تینوں صاحبان تین مختلف میدان سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک صاحب درجۂ اول کے صحافی ہیں۔ دوسرے صاحب کامیاب بزنس مین ہیں۔ اور تیسرے صاحب ایک سیاسی پارٹی کے لیڈر ہیں۔ تینوں دہلی کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

مسٹر ارن شوری (Tel. 6886644)

مسٹر پرمود کمار ستا (Tel. 4697971)

مسٹر مہیش چندر شرما (Tel. 2295212)

ہم سب لوگ ایک بڑے کمرے میں بیٹھ گئے جس کے ایک طرف سرسبز پارک دکھائی دیتا تھا اور دوسری طرف الماریوں میں رکھی ہوئی عربی اور انگریزی کتابیں نظر آرہی تھیں۔ آج شام کو سوا چھ بجے افطار کا وقت تھا۔ سائرن کی آواز آئی تو کھجور اور پانی سے افطار کیا گیا۔ وہ لوگ بھی ہمارے ساتھ اس میں شریک ہوئے۔

ایک صاحب نے کھجور کے بارے میں کہا کہ عرب میں چوں کہ کھجور ہی ملتی تھی اس لئے شاید روزہ افطار کرنے کے لئے کھجور مقرر کی گئی۔ میں نے کہا کہ یہ بات نہیں۔ کھجور کوئی روزہ افطار کا لازمی جزء نہیں ہے۔ وہ ایک رواج ہے نہ کہ مقدس شریعت۔ دوسری بات یہ ہے کہ کھجور کوئی کمتر درجہ کی چیز بھی نہیں۔ کھجور میں تمام اہم غذائی اجزاء ـــــ شکر، پروٹین، فیٹ، منرل وغیرہ موجود ہیں۔ اور وہ ایک مکمل خوراک ہے۔

سادہ افطار کے بعد اسی کمرہ میں ہم نے جماعت کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی۔ وہ لوگ قریب بیٹھے ہوئے نہایت خاموشی کے ساتھ ہماری نماز کو دیکھتے رہے۔

فراغت کے بعد جب میں دوبارہ دسترخوان پر آیا تو مسٹر ارن شوری نے پہلا سوال کیا کہ یہ نماز کیا ہے، اس کے بارے میں ہمیں بتائیے۔ ان کے سوال پر بقیہ تینوں صاحبان بھی

متوجہ ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوا کہ تینوں صاحبان نہایت سنجیدگی کے ساتھ نماز کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ نماز خدا کی عبادت ہے۔ اس کی ظاہری صورت تو ابھی آپ نے دیکھ لی۔ اب میں آپ کو اس کی اسپرٹ کے بارے میں کچھ بتاتا ہوں۔ جس طرح ہر چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے، اور ایک اس کی اندرونی حقیقت ہوتی ہے۔ اسی طرح نماز کا بھی ایک ظاہر ہے، اور اس کا دوسرا پہلو اس کی اندرونی حقیقت ہے۔

جب ہم نماز شروع کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں: اللہ اکبر، یعنی اللہ سب سے بڑا ہے۔ یہ اپنے آپ کو اس بات کا احساس دلانا ہے کہ خدا بڑا ہے، میں بڑا نہیں ہوں۔ اس طرح نماز کا پہلا سبق تواضع (modesty) ہے۔

اس کے بعد ہم سورۃ الفاتحہ پڑھتے ہیں جو ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے: الحمد للہ رب العالمین (ساری حمد اللہ کے لئے ہے جو سارے عالم کا رب ہے) یہ شکر (thanksgiving) کا کلمہ ہے۔ اس طرح نمازی اس احساس کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہے کہ خدا ہی سب کچھ دینے والا ہے، اس لئے ساری شکرگزاری بھی اسی کے لئے ہونا چاہئے۔

پھر نماز میں ہم ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ رکوع کی صورت میں آدھا جھکتے ہیں۔ پھر سجدہ کی صورت میں پورا جھک جاتے ہیں۔ ان حالتوں میں بار بار ایسے کلمات کہے جاتے ہیں جن میں اللہ کے سبوح اور قدوس ہونے کا اقرار ہوتا ہے۔ یہ نماز کا وہ پہلو ہے جس کو اطاعت (submission) کہا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ اطاعت کا معاملہ بے حد اہم معاملہ ہے۔ کیوں کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق، اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات اور ساری مخلوقات سے یہی مطلوب ہے۔ چنانچہ فروری ۱۹۸۴ میں جب ہم نے انگریزی الرسالہ جاری کیا تو اس کے پہلے شمارہ کے ٹائٹل پر یہ جملہ تھا کہ انسان اور کائنات دونوں کا مذہب ایک ہے، اور وہ اطاعت ہے:

Submission is the only religion for both: man and the universe.

پھر نماز کے آخر میں دائیں اور بائیں سلام پھیر کر کہا جاتا ہے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یعنی اے لوگو، تمہارے اوپر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔ ہندستان میں ہم اتر دکھن رخ کر کے ایسا کہتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں دوسری دوسری سمتوں کی طرف منھ پھیر کر یہی کلمات کہے جاتے ہیں۔ اس طرح روزانہ ہر نماز کے بعد مسلمان زمین کے چاروں طرف بسنے والے تمام لوگوں کی طرف اپنا رخ کر کے یہ دعا کرتے ہیں کہ تمہارے اوپر خدا کی رحمت اور سلامتی ہو۔ یہ نماز کا وہ پہلو ہے جس کو آپ امن (peace) کہہ سکتے ہیں۔

نماز کی اس تشریح کو سب لوگ بہت غور کے ساتھ سنتے رہے۔ آخر میں مسٹر ارن شوری نے کہا کہ اب میں نماز کو سمجھنے کے لئے چار لفظ یاد رکھوں گا ــــ ماڈسٹی، تھینکس گیونگ، سبمشن اور پیس:

Modesty, thanksgiving, submission, peace.

اس کے بعد ڈاکٹر مہیش چندر شرما نے کہا کہ اب روزہ کے بارہ میں کچھ بتائیے۔ میں نے کہا کہ روزہ کے لئے عربی لفظ صوم ہے۔ صوم کے لفظی معنی ہیں رک جانا (abstinence) روزہ کی بھی ایک ظاہری صورت ہے۔ اور دوسری چیز اس کی حقیقت ہے۔ روزہ کی ظاہری صورت تو آپ کو معلوم ہے۔ اس کی اسپرٹ یا اس کی حقیقت پرہیزگاری ہے۔ یہی مطلب ان لفظوں کا ہے جس کو ابھی ہم نے افطار کرتے ہوئے اپنی زبان سے ادا کیا۔ وہ الفاظ ہیں: اَللّٰھم لک صمت وعلیٰ رزقک افطرت۔ یعنی اے اللہ، میں نے تیرے کہنے سے روزہ رکھا، اور تیرے کہنے سے میں نے افطار کیا۔

انسان خدا کا بندہ ہے۔ اس لحاظ سے اس کو چاہئے کہ وہ خدا کا اطاعت گزار بنے مگر خدا جبری اطاعت کے بجائے آزادانہ اطاعت چاہتا ہے جو زیادہ اونچی صفت ہے۔ چنانچہ خدا نے ہم کو زمین پر پوری آزادی دیدی ہے۔ اب خدا چاہتا ہے کہ ہم کسی جبر کے بغیر خود اپنے ارادہ اور فیصلہ سے خدا کے حکموں کے پابند بن جائیں۔

یہ آزادی گویا انسان کی اخلاقی ترقی کا ایک کورس ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ انسان کے اندر خود انضباطی (self-discipline) کی صفت پیدا ہو۔ ہر انسان ایک با اصول انسان بن جائے۔ وہ فطرت کے مقرر اصول کے مطابق، خود اپنے ارادہ سے برائی کو چھوڑ دے،

اور خود اپنے ارادہ سے بھلائی کو اختیار کرے۔

روزہ میں آدمی خود اپنے فیصلہ کے تحت صبح کو کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے، اور پھر شام کو خود اپنے فیصلہ کے تحت دوبارہ کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے۔ یہ علامتی طور پر اسی آزادانہ اطاعت کی تربیت ہے۔ روزہ کا سبق یہ ہے کہ تم ایک بااصول زندگی گزارو، بغیر اس کے کہ خارج سے تمہارے اوپر کوئی جبر کیا گیا ہو۔ تم اپنے دل میں اچھے خیالات رکھو اور برے خیالات کو اپنے اندر سے نکال دو۔ تم اچھی بات بولو اور بری بات کے لئے اپنی زبان بند کر لو۔ تم اچھا عمل کرو اور برے عمل سے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے روک لو۔ اور یہ سب خود اپنے آزاد ارادہ کے تحت ہو نہ کہ کسی مجبوری کے تحت۔

آخر میں جب لوگ واپس جانے لگے تو ان کو جیسی مسائز کی نہایت خوبصورت چھپی ہوئی کتاب بطور تحفہ دی گئی۔ یہ الرسالہ بک سنٹر سے چھپی ہوئی تازہ انگریزی کتاب تھی جس میں دو سو احادیث رسول کے انگریزی ترجمے آرٹ پیپر پر چھاپے گئے ہیں۔ اس کا نام یہ ہے:

Words of the Prophet Muhammad
Selections from the Hadith

۱۱۲ صفحہ کی اس کتاب کے آغاز میں ایک صفحہ کا دیباچہ (Foreword) ہے۔ اس کا آخری پیراگراف یہ ہے کہ ان حدیثوں میں وہ چند اصول بتائے گئے ہیں جن کی طرف پیغمبر نے اپنے ماننے والوں کو رہنمائی دی۔ یہ سب ابدی اصول ہیں۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ ساری انسانیت کے لئے اہمیت رکھتے ہیں:

The following are some of the principles by which the Prophet sought to guide his followers. Eternal in essence, they are of value not only to Muslims but to humanity at large.

ایک انسانی کردار

قرآن (الاعراف ۷۶ - ۱۷۵) میں ایک انسانی کردار کی مثال دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اور ان کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں تو وہ ان سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین کا ہو رہا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا (واتل علیهم نبأ الذی آتیناه آیاتنا فانسلخ منها فاتبعه الشیطان فکان من الغاوین۔ ولو شئنا لرفعناه بها ولکنه اخلد الی الارض واتبع هواه)

اس آیت میں اس انسان کی مثال دی گئی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ ایسے حالات فراہم کرے جس کے اندر رہ کر وہ ایک دینی زندگی گزارے اور آخرت میں خدا کا انعام حاصل کرے۔ مگر وہ اس پر راضی نہ ہو اور حرص و ہوس میں مبتلا ہو کر ایک ایسی زندگی کی طرف بھاگ کھڑا ہو جس میں دنیا کی چمک دمک تو ہو مگر اس کی دینی اور اخروی زندگی اجڑ جائے۔ ایسے لوگوں کی بابت فرمایا کہ یہی گھاٹا اٹھانے والے لوگ ہیں (فاولئك هم الخاسرون) الاعراف ۱۷۸

ایک شخص کو خدا یہ موقع دے کہ وہ بقدر ضرورت روزی پر قناعت کر کے دینی زندگی گزارے مگر وہ بقدر عیش حاصل کرنے کی خاطر یہ کرے کہ دینی زندگی کو چھوڑ کر دنیوی زندگی کی طرف دوڑ پڑے تو اس کا یہ فعل مذکورہ قرآنی آیت کا مصداق ہوگا۔

اسی طرح ایک شخص کو مامور بن کر دین کا کام کرنے کا موقع ملے مگر وہ امیر بننے کے شوق میں اس کو استعمال نہ کر سکے۔ ایک شخص کو اقتدار سے باہر زبان و قلم کے ذریعہ دعوت دین کا کام کرنے کا موقع دیا جائے مگر وہ اقتدار کا منصب حاصل کرنے کی خاطر اپنے آپ کو اس سے محروم کر لے۔ ایک شخص کے لیے غیر مشہور حیثیت میں دین کی خدمت کرنے کے مواقع فراہم ہوں مگر اپنے آپ کو مشہور حیثیت میں دیکھنے کے پیچھے وہ تمام مواقع کو تباہ کر دے۔ جو لوگ ایسا کریں ان کی مثال اس انسان کی سی ہے جس کو خدا نے بلند حیثیت دینا چاہا مگر اس نے اپنے آپ کو پستی کی حالت میں گرا دیا۔

حرص دنیا کو چھوڑ کر ہی کوئی شخص دینی خدمت کا موقع اپنے لیے پا سکتا ہے۔

ایک سفر

لندن میں روحانی اتحاد (Festival of Spiritual Unity) کے نام سے ایک عمومی جلسہ ہوا۔ وہ ۳۰ جولائی سے ۷ اگست تک جاری رہا۔ اس کو لندن میں مقیم ہندستان کی ایک تجارتی فیملی مادھوانی پریوار (Madhvani Family) نے اسپانسر کیا تھا۔ اور اس کے آرگنائزر سوامی چیدانند تھے۔ اس کی دعوت پر انگلینڈ کا سفر ہوا۔

اس سفر کا پہلا تجربہ ۲۱ جولائی کو پیش آیا۔ ویزا کے سلسلہ میں مجھے نئی دہلی کی برٹش ایمبیسی جانا پڑا۔ وہاں پہنچا تو ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود ہندستانیوں کی ایک بہت بڑی بھیڑ وہاں لائن میں کھڑی ہوئی نظر آئی۔ یہ لوگ برطانیہ میں پیسہ کمانے کے لئے جا رہے تھے۔ ایک صاحب کی بات سن کر میں نے اپنے دل میں کہا: آج کی دنیا میں ہر آدمی آئیڈیل کی بات کرتا ہے۔ مگر ہر آدمی اپنے مفاد کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی کا مفاد دولت ہے، کسی کا اقتدار اور کسی کا شہرت اور مقبولیت۔

آخری دن جب کہ میں دہلی میں اپنی روانگی کی تیاری کر رہا تھا، ایک صاحب کا ٹیلیفون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ فلاں بزرگ صاحب اس وقت دہلی میں ہیں۔ بزرگ کے لئے لندن سے اسپانسر شپ کا کاغذ آیا ہے۔ حضرت دعوتی اور تربیتی نظام کے تحت لندن جانا چاہتے ہیں مگر ویزا کے لئے برٹش ایمبیسی جانا حضرت کے مزاج کے مطابق نہیں۔ اس لئے برٹش ایمبیسی میں ٹیلیفون کر کے کہیں کہ حضرت کو شخصی حاضری سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ حالاں کہ زیادہ بہتر یہ تھا کہ خدام جب ایسی تجویز پیش کریں تو حضرت یہ کہکر اسے رد کر دیں کہ نہیں، میں خود سفارت خانہ جاؤں گا تاکہ لوگوں سے میرا اختلاط ہو اور جس ملک میں میں جا رہا ہوں اس کے بارہ میں مجھے براہ راست معلومات حاصل ہوں۔ اسی دوری کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے بزرگ حالات حاضرہ سے بے خبر رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں حالات حاضرہ کا عرفان شامل نہیں ہوتا۔ چنانچہ سننے والے بھی ان کی باتوں کو صرف تبرک کے لئے سن لیتے ہیں اور بس۔ ایسے اسفار کو دعوتی اسفار کہنے کے بجائے برکتی اسفار کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

۲۸ جولائی کی شام کو جب کہ میں روانگی کے لئے تیاری کر رہا تھا، اچانک خوفناک

گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ کھڑکیوں کے دروازے بجنے لگے۔ گھر ہلنے لگا۔ یہ زلزلہ تھا۔ گھر کے چھوٹے بڑے سب ڈر گئے۔ ایک بچی رونے لگی۔ میرا ڈھائی سالہ پوتا عدنان بھی گھبرا اٹھا۔ وہ میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ دادا، یہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ زلزلہ۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولا کہ دادا آپ زلزلہ کو ڈنڈے سے مار دیجئے۔

گھر میں کبھی بلی آتی ہے تو عدنان کہتا ہے کہ دادا، بلی کو مار دیجئے۔ میں اپنی چھڑی سے اس کو بھگا دیتا ہوں۔ اس پر قیاس کرکے اس نے سمجھا کہ دادا زلزلہ کو بھی مار سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ زلزلہ اللہ کی طرف سے آتا ہے اور وہی اس کو روک سکتا ہے۔ میں یا تم اس کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس زلزلہ کا مرکز اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے قریب تھا۔ اس کی وجہ سے کچھ معمولی نقصانات ہوئے۔ دہلی کی تاریخی جامع مسجد میں دو اونچے میناروں کے علاوہ کچھ چھوٹے مینار ہیں۔ ایک چھوٹے مینار کا اوپر کا حصہ ٹوٹ کر نیچے گر پڑا۔

۲۸ جولائی کی شام کو ۱۰ بجے گھر سے ایئرپورٹ کے لئے روانگی تھی۔ روانگی سے پہلے سعودی عرب کے شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ العمار اور سعودی سفارت خانہ کے دو ذمہ دار ملاقات کے لئے آگئے۔ ان کے ساتھ مولانا عبد اللہ مدنی جھنڈانگری بھی تھے۔ دیر تک تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اکثر ملکوں کا سفر کیا ہے، اسلام کے اعتبار سے کس ملک کو آپ نے زیادہ بہتر پایا۔ انھوں نے کہا کہ یہ اضافی معاملہ ہے، کوئی کسی اعتبار سے بہتر ہے اور کوئی کسی اعتبار سے بہتر۔ مطلق طور پر کسی ایک ملک کو زیادہ بہتر نہیں کہا جا سکتا۔

انھوں نے ایک نئی بات یہ بتائی کہ فلپائن کا موجودہ شہر منیلا حقیقۃً امان اللہ تھا۔ مسلم عہد میں اس کا یہی نام تھا۔ بعد کو جب اس علاقہ سے مسلمانوں کو نکالا گیا تو جہاں اور چیزیں بدل گئیں وہاں شہر کا نام بھی بدل گیا۔ میں نے سوچا کہ تاریخ میں کتنی ہی چیزیں ہیں جن کے تشخص کو لوگوں نے بدل ڈالا ہے۔ آخرت میں جب ہر چیز اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے نمایاں ہوگی تو وہی کیفیت ہوگی جس کو ایک شاعر نے اس طرح کہا ہے:

لوگ محشر میں حیران رہ جائیں گے کہ تھی بات کیا ہم نے سمجھا تھا کیا

گھڑی میں گیارہ بج رہے ہیں۔ میں دہلی ایئرپورٹ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ انسانوں کا ہجوم

ہر طرف آتا اور جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ہر ایک کے ساتھ بھاری بھاری بوجھ ہے۔ مگر ہر ایک مخصوص پہیہ دار گاڑی پر اپنا سامان رکھے ہوئے ہے۔ چکنے اور ہموار فرش پر اس کی گاڑی پھسلتی ہوئی چلی جارہی ہے۔ پہیہ دار گاڑی نہ ہو تو ان سامانوں کو لے کر چلنا سخت مشکل ہو جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ "سب سے بڑی ایجاد پہیہ ہے" یہ بالکل درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس انسان نے پہلی بار پہیہ بنایا اس نے تاریخ انسانی کو ایک عظیم بڑھاوا عطا کیا۔ پہیہ کی ایجاد سے پہلے انسان کی تمدنی تاریخ ٹھہری ہوئی حالت میں تھی۔ پہیہ کی ایجاد نے اس کو ترقی کے سفر پر رواں دواں کر دیا۔

ایئرپورٹ پر سوامی ویوگانند سرسوتی سے ملاقات ہوئی۔ وہ گنگوتری میں رہتے ہیں۔ ان کو سنیاس لئے ہوئے ۴۵ سال ہو گئے۔ میں نے پوچھا کہ سنیاس جیون میں تو بڑا آنند آتا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ یہ گونگے کا گڑ ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا اس کو شبدوں میں نہیں کہا جا سکتا' بہت کہا جاتا ہے، پر وہ کہنے میں نہیں آتا" انھوں نے جواب دیا۔

ان کی باتیں سننے کے بعد میں نے کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے لمبی تپسیا کی ہے۔ انھوں نے بہت نرمی سے جواب دیا: اور تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بس اتنا کہوں گا کہ جب ہوش آیا تو پتہ چلا کہ ہو رہا ہے، کیا کچھ نہیں ہے۔

دہلی سے لندن کے لئے برٹش ایئرویز کی فلائٹ نمبر ۱۴۴ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ روانگی کا مقرر وقت ساڑھے ۱۲ بجے تھا۔ گھڑی کی ایک سوئی بارہ پر تھی اور دوسری سوئی ۶ پر کہ جہاز میں حرکت شروع ہوئی۔ چند منٹ کے بعد ہم زمین سے بلند ہو کر فضا میں پہنچ چکے تھے۔ اسی کے ساتھ کیلنڈر میں تاریخ بھی بدل گئی تھی۔ ہم گھر سے نکلے تو جولائی کی ۲۸ تاریخ تھی، مگر اب ہم جولائی کی ۲۹ تاریخ میں داخل ہو چکے تھے۔

راستہ میں برٹش ایئرویز کا میگزین ہائی لائف (High life) کا شمارہ جولائی ۱۹۹۴ دیکھا۔ اس میں ایک مضمون جدید کشتیوں کے بارہ میں تھا۔ اس کا عنوان تھا ڈریم بوٹس (Dream boats)۔ مضمون میں جدید طرز کی آرام دہ کشتیوں (Luxurious Yacht) کی خوشنما تصویریں تھیں اور ان کے بارہ میں ضروری تفصیلات درج تھیں۔ یہ کشتیاں انسانی حد تک آرام دہ اور خوبصورت ہوتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے اپنا وہ ۶۰ سال پہلے کا زمانہ یاد آیا جب میں یوپی کے ایک گاؤں میں رہتا تھا جو ایک ندی کے

کنارے آباد تھا۔ اس زمانہ میں ہم لکڑی کی بنی ہوئی سادہ کشتی پر بیٹھا کرتے تھے جو لمبے بانس کے ذریعہ چلائی جاتی تھی۔ اس وقت دور دور تک بھی میرے تصور میں نہ تھا کہ موجودہ "ڈریم بوٹ" جیسی کشتیوں کا وجود بھی کہیں ہوگا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ آج کی دنیا کے مقابلہ میں کل کی دنیا کا بھی ہے۔

یہ کافی بڑا جہاز تھا۔ میں نے ایک ایئر ہوسٹس سے پوچھا کہ اس جہاز میں کتنی سیٹ ہے۔ اس نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ ۴۵۰ سیٹیں ہوں گی۔ مگر مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ میں نے دوبارہ فلائٹ انجینئر سے پوچھا اس نے کہا کہ اس میں کل ۴۲۰ سیٹیں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ باتوں کو کتنا کم جانتے ہیں۔ پورا جہاز بھرا ہو نظر آیا۔ مسافروں میں زیادہ تر بنگلہ دیشی اور ہندستانی تھے۔ اتنے زیادہ ہندستانی کس لئے لندن جا رہے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ مزدوری کرنے کے لئے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں غیر ترقی یافتہ ملکوں کے جو لوگ ہیں، خواہ وہ کوئی عام آدمی ہو یا ڈاکٹر اور پروفیسر، سب ان ملکوں کے مزدور ہیں۔ وہ ان ملکوں کی اقتصادی مشین کو چلا رہے ہیں، صرف اس لئے کہ اپنے ملکوں کے مقابلہ میں یہاں ان کو کچھ زیادہ اجرت مل جاتی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے انگریزوں کی محکومی سے نجات حاصل کرنے کے لئے بے حساب قربانیاں دیں، مگر یہ عظیم جد وجہد جب کامیابی کے مرحلہ کو پہنچی تو جو فرق ہوا وہ صرف یہ تھا کہ جو لوگ پہلے ہم کو سیاسی محکوم بنائے ہوئے تھے، اب انھوں نے ہم کو اپنا اقتصادی مزدور بنا لیا۔

یہ دہلی سے لندن کے لئے نان اسٹاپ فلائٹ تھی۔ جہاز بلندی پر پرواز کرتا ہوا تیزی سے منزل کی طرف جا رہا ہے۔ پائلٹ کچھ کچھ دیر کے بعد اعلان کرتا ہے —— اب ہم پاکستان کے اوپر سے گذر رہے ہیں، اب ہم ایران کے اوپر سے گزر رہے ہیں، اب ہم ترکی کے اوپر سے گزر رہے ہیں، اب ہم بلغاریہ کے اوپر سے گزر رہے ہیں، اب ہم سوئزرلینڈ کے اوپر سے گذر رہے ہیں۔ اس طرح بلند پروازی کے ساتھ سفر مسلسل جاری رہا۔

میں نے سوچا کہ سفر ہزاروں سال سے انسان کا ایک مسئلہ تھا۔ پیدل، گھوڑا اور کشتی جیسی چیزوں سے انسان سفر کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ اہل مغرب نے ہوائی سفر کا طریقہ دریافت کیا۔ یہ گویا سفر کے مسئلہ کا ایک برتر حل (superior solution) تھا۔ اس دنیا میں وہی لوگ اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں جو کسی مسئلہ کا برتر حل دریافت کر سکیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی پسماندگی کا سبب کسی قوم یا قوموں کا ظلم نہیں ہے، بلکہ خود مسلمانوں کی یہ کوتاہی ہے کہ وہ انسانی مسائل کا کوئی برتر حل دنیا کے سامنے پیش نہ کر سکے۔

موجودہ مسلمان اس پوزیشن میں تو نہیں ہیں کہ جاپان کی طرح وہ صنعتی میدان میں کوئی برتر چیز انسان کو دے سکیں۔ البتہ مسلمانوں کے پاس ابدی طور پر ایک "برتر حل" ہے۔ یہ اسلام کی آئیڈیالوجی ہے۔ اسلام فکری اعتبار سے گویا ایک برتر آئیڈیالوجی ہے جو انسان کو اس کے فکری مسائل کا واحد صحیح جواب فراہم کرتا ہے۔ یہاں اسلام اور اہل اسلام کو دوسروں کے اوپر ابدی برتری حاصل ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلم دانشور اور رہنما ان کو احتجاج اور ٹکراؤ میں الجھائے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو احتجاج اور ٹکراؤ کی دلدل سے نکال کر فکری اور نظریاتی میدان میں لایا جائے۔ یہاں اجارہ داری کی حد تک ان کے لئے اعلیٰ مواقع حیات حاصل ہیں۔ یہاں وہ قوموں کو دینے کی پوزیشن میں ہیں، جب کہ دوسرے پہلوؤں میں وہ صرف لینے والوں کی قطار میں کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ساڑھے نو گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد ہم لندن ایئرپورٹ پر اتر گئے۔ اس وقت دہلی کی گھڑیوں میں ساڑھے نو بجے کا وقت تھا مگر لندن کی گھڑیوں میں اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ سوامی ویوگانند سرسوتی نے کہا: یہاں آکر مجھ کو پہلا احساس یہ ہوا کہ ہم ساڑھے چار گھنٹے پیچھے ہو گئے۔

کانفرنس والوں نے بہت اچھا نظم کیا تھا۔ ہم تین آدمی ہوائی جہاز سے نکلے تو دروازہ پر ایک خاتون ہماری رہنمائی کے لئے کھڑی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ایئرپورٹ کے تمام مراحل نہایت آسانی سے طے کرا دئے۔

ایئرپورٹ پر کافی لوگ موجود تھے۔ ان کے ساتھ کچھ دیر تک ایئرپورٹ پر ٹھہرا۔ اس کے بعد مسٹر سامی طیار کے ساتھ ایئرپورٹ سے ہوٹل کے لئے روانگی ہوئی۔ مسٹر سامی طیار ایک لبنانی مسلمان ہیں۔ ان کے والد ایک بڑے وکیل ہیں اور لندن میں رہتے ہیں۔ مسٹر سامی لاس اینجلز (امریکہ) میں بزنس کرتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ الاسلام تجدی کا ایک نسخہ لئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے آپ کی عربی کتابیں پڑھی ہیں۔ پچھلے سال لاس اینجلز کی سیرت کانفرنس میں جب میں نے سیرت پر اپنا مقالہ پیش کیا تھا اس وقت بھی وہ اس اجلاس میں موجود تھے۔ مگر ان سے پہلی ملاقات لندن میں ہوئی۔ مسٹر سامی کانفرنس کے دوران میرے مساعد کے طور پر متعین کئے گئے ہیں۔

لندن میں میرا قیام گرم ڈائک (Grim's Dyke) کے کمرہ نمبر ۳۰ میں تھا۔ یہ ایک تاریخی عمارت ہے جو لندن کے مضافات میں چالیس ایکڑ رقبہ میں واقع ہے۔ اس کی تاریخ ۶۰۰ ق م تک جاتی ہے۔

موجودہ شکل میں اس کو ۱۸۷۰ میں بنایا گیا تھا۔ ۱۹۶۹ سے وہ ہوٹل کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ یہ بے حد پرسکون جگہ ہے۔ اس کے چاروں طرف دور دور تک گارڈن ہی گارڈن نظر آتے ہیں۔ اس میں تقریباً ۵۰ بیڈ روم ہیں۔ وہ ہوٹل سے زیادہ رزورٹ معلوم ہوتا ہے۔ عام طور پر اس کو ایک (historical country retreat) سمجھا جاتا ہے۔ وہ اعلیٰ خاندان کی شادیوں، خصوصی ڈنر اور کانفرنس کے لئے مشہور ہے:

Old Redding, Harrow Weald, London HA3 6SH.

۲۹ جولائی کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز لندن کی سنٹرل مسجد میں پڑھی۔ ہوٹل سے مسجد تک کار سے آدھ گھنٹہ کا راستہ ہے۔ یہ سفر طے کرتے ہوئے سڑک کے دونوں طرف کے مناظر ایک منظم شہر کی تصویر پیش کر رہے تھے۔ ہر چیز میں نظم اور سلیقہ نمایاں تھا۔ مثال کے طور پر راستہ میں ایک ٹرک نظر آیا جس پر پیال (دھان کا ڈنٹھل) بھاری مقدار میں لدا ہوا تھا۔ ہندستان میں جب بھی میں نے کسی ٹرک پر پیال لدا ہوا دیکھا ہے تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی وحشت خیز کوڑا گاڑی سامنے سے گزر رہی ہو۔ مگر یہاں کا منظر مختلف تھا۔ یہ ایک عمدہ اور جدید ٹرک تھا۔ پیال کو مشینوں کے ذریعہ خوبصورت چوکور گانٹھوں کی صورت میں پیک کیا گیا تھا۔ یہ گانٹھیں ٹرک کے اوپر کامل نظم اور ترتیب کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں جیسے کہ مرصع چوکور بنڈل اس کے اوپر سجا کر رکھ دئے گئے ہوں۔

سنٹرل مسجد میں ہم لوگ ایک بجے پہنچے۔ اس وقت لاؤڈ اسپیکر پر قرأت ہو رہی تھی۔ سوا بجے "الفاتحہ" کے ساتھ قرأت ختم ہوئی۔ اذان کے بعد ۱۰ منٹ کے اندر لوگوں نے سنتیں پڑھیں۔ اس کے بعد امام نے طویل خطبہ دیا۔ پہلا خطبہ عربی میں تھا اور دوسرے خطبہ کا بڑا حصہ انگریزی میں۔ نماز کے بعد امام نے سلام پھیرنے سے پہلے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ بلند آواز سے کہا۔ اس کے بعد دائیں طرف منھ کر کے ایک بار صرف السلام علیکم کہا۔ البتہ مؤذن نے دونوں طرف السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا۔

وسیع مسجد اندر اور باہر، اوپر اور نیچے ہر طرف بھری ہوئی تھی۔ قرأت فاتحہ کے بعد آمین کی آواز سے مسجد گونج اٹھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ نمازیوں میں بڑی تعداد عربوں کی ہے۔ نماز کے بعد مسجد سے باہر نکلے تو یہاں چندہ مانگنے والوں کا ہجوم تھا۔ کوئی پوسٹر بانٹ رہا تھا۔ کوئی بلند آواز سے کوئی امدادی اعلان کر رہا تھا۔ ایک صاحب جو غالباً الجزائر کے لئے تعاون مانگ رہے تھے، وہ چیخ چیخ کر

کہہ رہے تھے : این حکام العرب من بوسنة، این حکام العرب من کشمیر۔ ایک صاحب بوسنیا کے لئے امداد کا بورڈ لگائے ہوئے تھے۔ اس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا :

Bosnia needs action not pity.

بورڈ پر بوسنیا کے ٹوٹے ہوئے مکانات اور دوسرے تباہی کے مناظر تھے۔ اس کے اوپر لکھا ہوا تھا کہ اپنی زندگی کا مقابلہ ان سے کیجئے :

Compare your life to theirs.

میں نے کہا کہ یہ مقابلہ ادھورا ہے۔ انگلستان کے مسلمان ہم آہنگی کے اصول کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور بوسنیا کے مسلمانوں نے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیا۔ اب دونوں اپنی اپنی قیمت پا رہے ہیں۔ ورنہ ٹکراؤ چھیڑنے سے پہلے بوسنیا کے مسلمان بھی اسی طرح اچھی حالت میں تھے جیسے بقیہ یورپ کے مسلمان اچھی حالت میں رہ رہے ہیں۔

اس فیسٹول میں دلائی لاما، شنکراچاریہ، مدرٹریسا وغیرہ کو بھی آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ مگر مختلف وجوہ سے وہ لوگ نہ آسکے۔ مدرٹریسا نے اسپتال سے اپنا ایک پیغام بھجوایا تھا۔ اس پیغام کا ایک حصہ یہ تھا :

The fruit of prayer is faith,
The fruit of faith is love,
The fruit of love is service,
The fruit of service is peace.

ایک سردار جی سے بات کرتے ہوئے میں نے اقبال کا یہ مصرعہ پڑھا :
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا۔ انھوں نے فوراً کہا، اقبال نے تو گرونانک کو یہ بھی کہا ہے :

ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

اس فیسٹول میں سب سے زیادہ حصہ مادھوانی پریوار نے لیا تھا۔ ایک صاحب نے اپنی تقریر میں منوبھائی کی سرلتا اور اداّرتا کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ منوبھائی کو میں تاجر کے روپ میں نہیں بلکہ سنت کے روپ میں دیکھتا ہوں۔ گھر گھر میں پوجا کا سنکلپ لیا ہے انھوں نے۔ شری منوبھائی مادھوانی نے اپنی تقریر میں کہا : میرے پرماتما کون ہے ——— ہنومان جی۔ میں نے پانچ سو بار ہنومان جی سے اپنا دکھ درد کہا ہے۔ ہنومان جی نے پوجیہ باپو (مراری) کو بھیجا، انگلینڈ میں بھارت کی مہانتا قائم کرنے کے لئے۔ میں گورو

سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ مادھوانی پریوار ہی کر سکتا ہے۔

اس قسم کی باتیں لوگوں کی زبان سے سن کر میں نے سوچا کہ آدمی کو جب دین حق نہ ملے تو وہ دین امانی میں پناہ لیتا ہے۔ حتی کہ مسلمان بھی اگر قرآن سے کٹ جائیں تو دوسری چیز جہاں جاکر وہ ٹھہریں گے وہ دین امانی ہوگا، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

لندن سے ۱۹۸۲ میں ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ساڑھے تین سو صفحہ کی اس کتاب کا نام ہے ——— مسلمانوں کی دریافت یورپ:

Bernard Lewis, The Muslim Discovery of Europe.

اس کتاب کے تعارف میں لندن کے اخبار سنڈے ٹائمس نے لکھا تھا کہ گیارھویں صدی عیسوی کی مسلم دنیا ایک عظیم تہذیب تھی۔ وہ ایک ایسے آرٹ اور سائنس کا مرکز تھی جو اسپین سے مڈل ایسٹ تک پھیلا ہوا تھا۔ جب کہ اسی زمانہ میں یورپ تاریک ادوار (dark ages) میں پڑا سو رہا تھا۔ یہ دونوں دنیائیں ایک دوسرے کے بارہ میں بہت کم جانتی تھیں:

The two world knew little of one another.

کہا جاتا ہے کہ یہ جدید کمیونی کیشن سے پہلے کی بات ہے۔ ورنہ آج ساری دنیا ایک گلوبل ویلج بن چکی ہے۔ آج منٹوں میں ایک علاقہ کی خبر دوسرے علاقہ میں پہنچ جاتی ہے۔ مگر ایک اور اعتبار سے آج بھی صورتحال زیادہ مختلف نہیں۔ آج بھی مسلم دنیا بڑی حد تک مغرب کے حقیقی افکار سے ناآشنا ہے۔ اسی طرح مغربی دنیا بھی بڑی حد تک اسلام کی حقیقی تصویر سے بے خبر ہے۔ مسلم دانش ور "مغرب" کے نام سے ایک ایسی دنیا کو جانتے ہیں جو اسلام کی دشمن ہو۔ اور مغربی دانشور "اسلام" کے نام سے ایک ایسے مذہب کو جانتے ہیں جو دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے۔ دور آگہی میں بھی انسان کی بے خبری ختم نہیں ہوئی۔

دوسری عالمی جنگ سے پہلے لندن کو دنیا کے نمبر ایک شہر کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ خاص شہر (the city) کہا جاتا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد جب برٹش ایمپائر ٹوٹا تو لندن کی حیثیت بھی اسی طرح بہت کم ہوگئی جس طرح سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد ماسکو کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔

اسی مہینہ اگست ۱۶۶۶ میں لندن میں اس کی تاریخ کی سب سے بڑی آگ لگی تھی جس کو عظیم آگ

(great fire) کہا جاتا ہے۔ اس آگ میں لندن کا تقریباً دو تہائی حصہ تباہ ہو گیا تھا۔ تیرہ ہزار مکانات جل کر خاک ہو گئے۔

لندن کی سڑکوں پر چلنا اس سے بہت زیادہ مختلف تجربہ ہے جو دہلی میں پیش آتا ہے۔ یہاں ہارن کی آوازیں نہیں۔ ہوائی کثافت موجود ہے مگر وہ دہلی کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اگرچہ گاڑیوں کی تعداد یہاں دہلی سے زیادہ ہے۔ سڑک کے کنارے فوٹ پاتھ کی دکانداری کا یہاں کوئی وجود نہیں۔ جس علاقہ میں بھی میں گیا مجھے صفائی اور باقاعدگی نظر آئی۔ پرانی اور شور مچاتی ہوئی چلنے والی گاڑیاں کہیں نظر نہیں آئیں۔ لوگ نظم کے ساتھ اِدھر اُدھر جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سڑکوں پر کہیں ٹوٹ پھوٹ دکھائی نہیں دی جو کہ دہلی وغیرہ میں عام ہے۔

ایک مرتبہ میں ایک سڑک پر جا رہا تھا کہ ایک بڑی گاڑی آواز لگاتی ہوئی اور تیزی سے بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ یہ ایمبولنس کی گاڑی تھی۔ یہاں کوئی گاڑی جب بھی اس طرح سڑک پر دوڑ رہی ہو تو سمجھ لیجئے کہ وہ یا تو ایمبولنس کی گاڑی ہے یا فائر بریگیڈ یا پولیس کی۔ ایک عرب نوجوان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ انڈیا اور یو کے میں یہ فرق ہے کہ یہاں ہر چیز میں اسٹینڈرڈائزیشن ہو چکا ہے۔ مگر انڈیا میں کسی چیز کا کوئی اسٹینڈرڈ نہیں۔ وہاں کا معروف اصول یہ ہے: سب چلتا ہے۔

برطانیہ کی اسٹیٹ جدید اصطلاح کے مطابق ویلفیر اسٹیٹ ہے۔ یہاں تعلیم، علاج، ہر چیز فری ہے۔ قیمتیں دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں بہت کم ہیں۔ ایک عرب نوجوان جو یہاں شادی کر کے رہ رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ اگر میں اپنی ماں کو بلاؤں تو جب تک وہ یہاں رہیں گی، اگر میں چاہوں تو اس پوری مدت کے لئے ان کا خرچ حکومت سے وصول کر سکتا ہوں۔ ان چیزوں کا سب سے زیادہ فائدہ غالباً ہندستان اور پاکستان کے باشندوں نے اٹھایا ہے۔ لیکن اگر آپ لوگوں سے ملیں تو یہاں کے نظام سے سب سے زیادہ شاکی ہندستانیوں اور پاکستانیوں ہی کو پائیں گے۔ ملے ہوئے کو نہ دیکھنا اور نہ ملے ہوئے کو دیکھنا یہ ان کا عام مزاج بن گیا ہے۔ یہاں بھی اور خود اپنے ملک میں بھی۔

ہوٹل میں کانفرنس کے شرکاء کے لئے خالص "انڈین فوڈ" کا انتظام کیا گیا تھا۔ ناشتے کی میز پر میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ انڈیا اور پاکستان اور بنگلہ دیش کے لوگ یہاں فوڈ کا بہت بڑا بزنس کر رہے ہیں۔ انھوں نے انڈین فوڈ کو نئے طریقہ پر بنا کر اور اس کو ماڈرن پیکنگ

کے ساتھ یہاں کامیابی کے ساتھ چلایا ہے۔ بہت سے انگریز بھی انڈین فوڈ کو استعمال کرنے لگے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بنگلہ دیش اور پاکستان کے لوگ بھی کافی اس بزنس میں ہیں۔ مگر ہر ایک اس کو انڈین فوڈ کے نام سے بازار میں لاتا ہے نہ کہ پاکستانی فوڈ یا بنگلہ دیشی فوڈ کے نام پر۔ کیونکہ انڈین فوڈ سے اس کو شہرت ہو چکی ہے۔ کوئی اور نام چلایا جائے تو لوگوں کو وہ نامانوس معلوم ہوگا۔

میں نے کہا کہ اس کا راز انفرادی مفاد ہے۔ چوں کہ تجارت کے اعتبار سے اس میں فائدہ ہے کہ اس کو انڈین فوڈ کے نام سے بازار میں لایا جائے، اس لئے ہر تاجر بلا اعتراض اس نام کو استعمال کر رہا ہے۔ مگر جب قومی مفاد کے لئے ایسا کوئی مشترک لفظ بولا جائے تو یہی لوگ فوراً اس کی مخالفت کے لئے کھڑے ہو جائیں گے، کیوں کہ اب ان کا ذاتی مفاد اس سے وابستہ نہیں۔

یہاں آجکل رات چھوٹی ہے اور دن لمبا۔ فجر کا وقت یہاں تقریباً انڈیا کے مطابق ہے، یعنی صبح ساڑھے چار بجے۔ لیکن مغرب کا وقت یہاں آجکل شام کو ۹ بجے ہوتا ہے۔ بعض اوقات رات اور دن کا یہ فرق اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان جو عرصہ سے برطانیہ میں رہتے ہیں، ان سے یہاں کے مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی حالت پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ بعض استثنائی افراد کو چھوڑ کر سارے مسلمانوں کا مذہب صرف ایک ہے، اور وہ منی (money) ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان مسلمانوں کا مذہب حقیقۃً مانو تھی ازم نہیں ہے بلکہ منی تھی ازم ہے۔ (یعنی توحید پرستی نہیں بلکہ دولت پرستی)

یہاں امرتسر کے چیف جسٹس دار پروفیسر منجیت سنگھ بھی آئے ہوئے ہیں۔ ان سے چند بار ملاقات ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی روایت کے مطابق، اگرچہ اپنے کندھے سے ایک کرپان لٹکائے ہوئے تھے اور ہاتھ میں بڑی تلوار لئے ہوئے تھے۔ مگر وہ اتنے میٹھے اور نرم انداز میں بول رہے تھے جیسے کہ ان کا "کرپان کلچر" سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی ہر بات میں سادگی اور متانت ٹپک رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اسی دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس تلوار نہیں، مگر وہ اتنے جارحانہ انداز میں بولتے ہیں جیسے کہ وہ تلواروں کے بادشاہ ہوں۔ دوسری طرف اسی دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس تلوار ہے مگر وہ اپنی تلوار کو اس کی روایتی حد کے اندر رکھتے ہیں۔ اپنی بولی اور اپنے عمومی سلوک میں اس کو دخیل ہونے نہیں دیتے۔

۳۰ جولائی کی صبح کو کمرہ سے باہر ٹہلنے کے لئے نکلا تو سوامی ویوگانند سرسوتی پہلے ہی سے باہر آکر ٹہل رہے تھے۔ انھوں نے اپنی ایک ہندی کتاب مجھے دی۔ یہ ۱۱۰ صفحہ کی کتاب ہے۔ سوامی جی سے میں نے پوچھا کہ اس کتاب کا خلاصہ بتایئے۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب میں تین باتیں بتائی گئی ہیں۔ (۱) جو سامنے دکھائی دے اس کی سیوا کرنا۔ (۲) جس کی شکتی سے دکھائی دے رہا ہے اس سے پریم کرنا۔ (۳) سیوا یا پریم کے بدلے کچھ نہ چاہنا۔ آخر میں انھوں نے کہا: کچھ نہیں چاہنے سے اپنا کام ہو جاتا ہے۔

گنگوتری میں سوامی جی کا ایک بڑا آشرم ہے۔ وہاں ہر روز تقریباً پانچ سو آدمی کھانا کھاتے ہیں۔ "مگر بھوجن اور واس کا ہمارے یہاں کوئی چارج نہیں"۔ سوامی جی کے ساتھیوں نے کہا کہ اس طرح کیسے آشرم چلے گا۔ سوامی جی نے جواب دیا: آشرم تو چل ہی رہا ہے۔ پر جس دن تم چلاؤ گے اسی دن سے وہ نہیں چلے گا۔

۳۰ جولائی کو کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ اس کا انتظام راونڈ وڈ پارک میں کیا گیا تھا جو بہت بڑا ہے۔ اس میں کافی بڑا شامیانہ لگایا گیا تھا۔ ۱۰ بجے میں وہاں پہنچا تو اس کو دیکھ کر پہلا تاثر یہ ہوا کہ لندن کا شامیانہ بھی ترقی یافتہ ملک کے معیار کا ہے۔ شامیانہ سادہ بھی تھا اور خوبصورت بھی۔ وہ اتنا لمبا تھا کہ ایک سرے پر کھڑے ہوں تو دوسرا سرا صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پورا شامیانہ بھرا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ باہر بھی کھڑے ہوئے نظر آئے۔

لندن میں انڈیا کے ہائی کمشنر ڈاکٹر ایل ایم سنگھوی نے افتتاحی تقریر کی۔ وہ نہ صرف ایک ڈپلومیٹ ہیں بلکہ مذہبیات کے ایک اچھے عالم بھی ہیں۔ اس کے بعد چند اور تقریریں ہوئیں۔ منو بھائی مادھوانی کی فیملی تنہا پوری کانفرنس کا خرچ دے رہی ہے جس کا بجٹ تین کروڑ روپیہ سے زیادہ ہے۔ منو بھائی نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اس سے پہلے وہ یوگنڈا میں بزنس کرتے تھے۔ ۱۹۷۲ میں عیدی امین نے ان کو پکڑ کر قید خانہ میں ڈال دیا۔ قید خانہ میں انھوں نے گیتا اور دوسری مذہبی کتابیں پڑھیں، اس سے ان کا ذہن بدلا۔ جیل سے رہائی پاکر وہ لندن آگئے اور یہاں دوبارہ اپنا بزنس قائم کیا۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ مذہب اور روحانیت کے پرچار کے لئے استعمال کریں گے۔ اسی کے مطابق وہ موجودہ کانفرنس کر رہے ہیں۔

آخر میں شری مراری باپو کی کتھا ہوئی جو کئی گھنٹہ تک جاری رہی۔ ان کے ساتھ تربیت یافتہ

FESTIVAL OF SPIRITUAL UNITY 1994

Chief Patron: His Excellency Dr L.M. Singhvi
High Commissioner for India

INVITATION LIST

PUJYA SANT SHRI MORARI BAPU

HIS DIVINE HOLINESS SHREE PRAMUKH SWAMI MAHARAJ

PUJYA SWAMI SATYAMITRANAND GIRIJI

PUJYA SANT SHRI RAMESHBHAI OZA

PUJYA SANT SHRI KRISHNA SHANKAR SHASTRI (DADAJI)

PUJYA SANT GOSWAMI SHREE INDIRA BETIJI

GURUDEV SHREE CHITRABHANUJI

DR. SADHAVI SADHANAJI

PUJYA MAULANA VAHIDUDIN KHAN SAHEB

PROFESSOR SARDAR MANJIT SINGHJI
(Chief Jathedar Akal Takhat)

DR MOHINDER SINGH

PUJYA SWAMI CHIDANAND SARASWATI (MUNIJI)

SWAMI YOGANAND SARASWATI

DAYARAMBAPU

PROFESSOR VIDYANIWAS MISHRA

REV. MARCUS BRAYBROOK
(Chairman of World Congress of Faiths)

SIR SIGMUND STERNBERG
(Chairman of the Council of Christians and Jews)

MOST VENERABLE DR M. VAJIRAGNANA
(Chief Sanghanayaka of Great Britain - The London Buddist Vihara)

THE MOST REV. TREVOR HUDDLESTONE
(Former Archbishop of the Indian Ocean)

TOTAL : 19 confirmed

سازندوں کی پوری ٹیم تھی۔ لمبی کتھا کے بعد انھوں نے "بولئے ہنومان جی کی جے" کہہ کر مخصوص انداز میں تقریر شروع کی۔ شری ہنومان جی کو انھوں نے رام دوار بتایا۔ انھوں نے کہا کہ ۱۸۸۳ میں جب سوامی ویویکانند امریکہ گئے تو کسی نے ان کو چڑھانے کے لئے پوچھا کہ سوامی جی، آپ کی گھڑی میں کتنا بجا ہے۔ سوامی جی نے کہا کہ ایک۔ کچھ دیر کے بعد اس نے دوبارہ پوچھا۔ سوامی جی نے دوبارہ کہا کہ ایک۔ کچھ دیر کے بعد اس آدمی نے پھر یہی سوال کیا۔ سوامی جی نے پھر کہا کہ ایک۔ اب اس آدمی نے مذاق کے انداز میں سوامی جی سے کہا کہ سوامی جی، آپ کیسی گھڑی پہن کر امریکہ آئے ہیں جس میں ہر وقت ایک ہی بجا رہتا ہے۔ سوامی ویویکانند نے نرمی سے جواب دیا: میرے بھائی، سادھو ادویت واد ہوتا ہے۔ وہ دویت کو مانتا نہیں اس لئے اس کی گھڑی میں تو ہمیشہ ایک ہی بجے کا سمے رہتا ہے۔ غالباً اس آدمی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے بعد وہ یہ کہے کہ معاف کیجئے گا، میں بھی ایک بار اس عجیب گھڑی کا تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔

مراری باپو نے اچھی زندگی کا خلاصہ تین لفظوں میں بتایا ـــــ ہمارے پاؤں میں بل ہو۔ ہمارے ہاتھوں میں پھل ہو۔ ہماری آنکھوں میں جل ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بل اہنکار شونیہ ہو۔ پھل ادھیکار شونیہ ہو اور جل پریم اور کرونا کا جل ہو۔

مراری باپو نے اپنی بات کی وضاحت کے لئے ایک اور قصہ سوامی ویویکانند کا سنایا۔ سوامی جی ایک بار کسی عیسائی کے یہاں گئے۔ اس نے اپنے کمرہ میں کچھ کتابیں اس طرح رکھیں کہ سب سے نیچے رام چرت مانس تھی۔ اس کے اوپر مختلف مذہبوں کی کتابیں، اور پھر سب سے اوپر بائبل۔ سوامی ویویکانند جب کمرہ میں داخل ہوئے تو اس نے مسکرا کر کہا کہ سوامی جی، اس کو دیکھئے۔ سوامی ویویکانند اس پر برہم نہیں ہوئے کہ ان کی مقدس کتاب سب سے نیچے رکھی ہوئی ہے۔ انھوں نے اطمینان کے ساتھ کہا: فاؤنڈیشن تو بہت سندر ہے۔ یہ واقعہ اس بات کی مثال ہے کہ آدمی کس طرح اپنے مائنس کو پلس میں تبدیل کر سکتا ہے۔

مراری باپو نے ایک اور قصہ اس طرح بتایا کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو ہر ہفتہ دس روپیہ جیب خرچ دیتا تھا۔ بیٹا اس کو خرچ نہیں کرتا تھا بلکہ رامائن کے اندر رکھ دیتا تھا جو اس کی میز پر کھلی پڑی ہوئی تھی۔ اس طرح بہت سے روپئے اس کے اندر اکٹھا ہو گئے۔ باپ نے دیکھا تو کہا کہ تم کو پیسہ رکھنا تھا تو کہیں بند کر کے رکھتے۔ اس طرح تو وہ چوری ہو سکتا ہے۔ بیٹے نے جواب دیا کہ میرا پیسہ یہاں سب سے

زیادہ محفوظ ہے۔ کیوں کہ جو چور ہوگا وہ رامائن کھولے گا نہیں۔ اور جو رامائن کھولے گا وہ چوری کریگا نہیں۔

مراری باپو کی کتھا کے آخر میں میں نے دیکھا کہ سیکڑوں لوگ اپنی جگہ پر کھڑے ہوگئے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ یہ لوگ شاید اٹھ اٹھ کر جا رہے ہیں۔ مگر وہاں معاملہ دوسرا تھا۔ یہ لوگ اٹھ کر نہایت جوش کے ساتھ بالکل وارفتگی کے عالم میں زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ ایک صاحب نے اس کو روحانی کیفیت سے تعبیر کیا۔ میں نے کہا کہ اگر یہ روحانیت ہو تو تماشا آخر کس چیز کا نام ہوگا۔

دہلی سے ڈاکٹر مہندر سنگھ بھی آئے تھے۔ ایک گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ہم تو اپنے کو مائنارٹی سمجھتے ہی نہیں۔ آپ دیکھئے، سکھ لوگ اس ملک میں صرف دو فیصد ہیں۔ مگر یہاں کے پنجاب اور یہاں کی اقتصادیات میں انھوں نے ۲۵ فیصد پر قبضہ کر رکھا ہے۔ پھر مائنارٹی کہہ کر ہم کیوں اپنے آپ کو گھٹائیں۔

اکال تخت کے چیف جتھے دار بھی یہاں آئے ہیں۔ ایک بار ہم دونوں ایک ہی کار میں سفر کر رہے تھے۔ رو پہلے رنگ کی ایک چھوٹی کرپان وہ کندھے سے لٹکائے ہوئے تھے اور سنہرے رنگ کی بڑی تلوار اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ سوا دو سو سال پرانی ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ کبھی استعمال ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو ایک سمبل ہے روحانی اتھارٹی کا۔ استعمال کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

۳۰ جولائی کی شام کو ایشین ایج کی ٹیم اور سن رائز ریڈیو کی ٹیم قیام گاہ پر آئی۔ دونوں نے الگ الگ تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایشین ایج کا انٹرویو انگریزی میں تھا، اور سن رائز ریڈیو کا "ہندی پروگرام" کے تحت ہندی (آسان اردو) میں۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ایشیائی کمیونٹی جو برطانیہ میں رہتی ہے، اس کے لئے یہاں باعزت زندگی حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ یہ کہ وہ یہاں لینے والے گروہ (taker group) بن کر نہ رہیں بلکہ دینے والے گروہ (giver group) بن جائیں۔ یہاں کے باشندوں کو محسوس ہو کہ آپ ان کے لئے نفع بخش گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کا یہی واحد راز ہے، باہر کے دیش میں اور خود اپنے دیش میں بھی۔

ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ یہاں کے نوجوان طبقہ کو میرا پیغام یہ ہے کہ وہ اپنی سوچ پر نظر ثانی کریں۔ انھوں نے مسرت (pleasure) کو مطلق (absolute) چیز سمجھ لیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسرت سے غیر محدود طور پر لطف اندوز ہوں۔ مگر ایسا اس دنیا میں ممکن نہیں۔ انسان خود اپنی محدودیتوں کی وجہ سے لامحدود طور پر چیزوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے آپ لوگ حقیقت پسند بنئے۔ زندگی کا سکھ حقیقت پسند بننے میں ہے۔ لذت پسندی کا موجودہ رجحان آپ کو آخر کار فرسٹریشن کے سوا کہیں اور پہنچانے والا نہیں۔

دوپہر کا کھانا اجتماع گاہ میں تھا۔ ہندستانی انداز میں تھال کے اندر رکھ کر کھایا گیا۔ کھانے کے بعد جب میں بذریعہ کار ہوٹل کی طرف واپس آرہا تھا تو راستہ میں بھورے رنگ کی ایک خوبصورت عمارت دکھائی دی۔ اس میں نہایت خوبصورت حرفوں میں لکھا ہوا تھا: برہما کماری اسپریچول یونیورسٹی۔

ایک صاحب نے بتایا کہ منو بھائی نے ۱۹۷۲ میں جب جیل کے اندر گیتا اور دوسری مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا تو اس کے بعد انھوں نے ہنومان جی کو پالیا۔ وہ تاجر کے ساتھ سنت بن گئے۔ "گھر گھر میں پوجا کا سنکلپ لیا ہے انھوں نے۔" اسی کا ایک اظہار یہ فیسٹول ہے۔ یہ سن کر میں سوچنے لگا کہ شاید ایک غیر حقیقی چیز پر بھی آدمی کو اتنا ہی یقین ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک حقیقی چیز پر

پچھلے دو سال کے اندر مجھے ہندو حلقوں میں جانے کا بہت زیادہ موقع ملا ہے۔ میں نے بہت زیادہ ان کو سنا ہے اور بہت گہرائی تک ان کو دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہندو سنتوں اور گرووں کے اجتماعات میں لاکھوں لوگ دیوانہ وار آتے ہیں اور نہایت ذوق و شوق کے ساتھ ان کی باتیں سنتے ہیں۔ مگر میرا آخری تاثر یہ ہے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو سائنٹفک اصول پر قائم ہے۔ بقیہ تمام مذاہب، تحریف کے نتیجہ میں، غیر معقول صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اب وہ یا تو طلسماتی افسانے ہیں یا روحانی شاعری۔ کسی بھی دوسرے مذہب کی کوئی سائنٹفک بنیاد نہیں۔ دوسرے مذاہب پر لوگ اس لئے قائم ہیں کہ وہ ان کو ایک روایتی ضمیمہ کے طور پر لئے ہوئے ہیں۔ اگر وہ اپنے مذہب پر اپنی عقل کو استعمال کریں تو شاید کوئی بھی ان مذاہب کو اختیار نہ کر سکے۔

تاہم یہ بات میں قرآن وسنت والے اسلام کے بارہ میں کہہ رہا ہوں۔ جہاں تک اس اسلام کا تعلق ہے جس کی نمائندگی موجودہ زمانہ کے مسلمان کر رہے ہیں، وہ بھی بڑی حد تک غیر معقول صورت اختیار کر چکا ہے۔ وہ اضافوں کے نتیجہ میں دین بدعت ہے نہ کہ دین مسنون۔ کچھ مسلم مفکرین نے بطور خود اسلام کا ایک "انقلابی اڈیشن" نکالا ہے۔ مگر یہ انقلابی اڈیشن "حقیقۃً" ایک محرف اڈیشن ہے۔ اس خود ساختہ اسلام نے لوگوں کو اسلام سے قریب کرنے کے بجائے انھیں اسلام سے دور کر دیا ہے۔ مسلم ملکوں میں بھی اور غیر مسلم ملکوں میں بھی۔

اس قسم کے کچھ انقلابی نوجوانوں سے لندن میں ملاقات ہوئی۔ ان کا تعلق تونس سے تھا۔ انھوں نے آٹھ صفحہ کا اپنا "نشریہ سیاسیہ" دیا جس کو وہ مہینہ میں دو بار شائع کرتے ہیں۔ اس "نصف شہریہ" کا نام ہے، تونس الشہید۔ یعنی مقتول تونس۔ ان کے نزدیک تونس کے موجودہ حکمرانوں نے تونس کو اسلامی اعتبار سے قتل کر ڈالا ہے۔ اسی قسم کے جنونی لوگ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس موت کی خوراک تو بہت ہے، مگر ان کے پاس آج کے انسان کے لئے زندگی کا کوئی پیغام نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ مکمل اسلام کے علم بردار ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس محرف اسلام کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔

۳۱ اگست کو فیسٹیول کا دوسرا دن تھا۔ مخصوص روایتی انداز میں ہم لوگ جلسہ گاہ کے اندر لیجائے گئے۔ جب میں ڈائس پر پہنچ کر اپنی نشست گاہ پر بیٹھا تو نظر آیا کہ لمبا پھیلا ہوا شامیانہ اس سرے سے اس سرے تک پورا بھر چکا ہے۔ لوگ وقت سے پہلے ہی آکر اپنی جگہ بیٹھ چکے ہیں۔ یہاں ہر روز تمام شرکاء کو مفت لنچ دیا جاتا ہے۔ آج سولہ ہزار افراد نے یہاں کھانا کھایا۔ اگر واپس جانے والوں کی تعداد کو شامل کر لیا جائے تو غالباً تمام شرکاء کی تعداد ۲۵ ہزار کے قریب ہوگی۔

آج پہلی تقریر ایک جینی پیشوا شری چتر بھانوجی کی ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ جب وہ ۲۰ سال کے تھے تو انھوں نے مہاویر کا ایک واقعہ پڑھا۔ اس میں انھوں نے بتایا تھا کہ جس طرح چھوٹے سے بیج کے اندر ایک پورا درخت ہوتا ہے، اسی طرح تمہاری آتما کے اندر پرماتما چھپا ہوا ہے۔ اس کو جان لو تو تم پرماتما ہو جاؤ گے۔ اس کو پڑھ کر میرے اندر انقلاب آگیا۔ اس کے بعد میں سنیاس لے کر گھر سے نکل گیا۔ اب میں ۷۰ سال کا ہوں۔ اب بھی روزانہ اٹھارہ گھنٹہ

کام کرتا ہوں، پر مجھ کو تھاک نہیں لگتی ہے۔ اس لئے کہ میں آپ لوگوں کا آشیرواد لیتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ رام اجودھیا میں نہیں ہے، رام گھٹ گھٹ میں ہے۔

ان کا ایک سنٹر بمبئی میں ہے اور دوسرا امریکہ میں۔ اس کا نام جین میڈیٹیشن سنٹر ہے۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں امریکہ گیا تو وہاں میں نے دیکھا کہ گائے جب تک دودھ دیتی ہے لوگ اس کو پالتے ہیں۔ اور جب دودھ دینا بند کر دیتی ہے تو وہ فوراً سلاٹر ہاؤس کو ٹیلی فون کرتے ہیں کہ یہ گائے ہم کو نہیں چاہئے۔ اس کے بعد سلاٹر ہاؤس والے اس گائے کو ذبح کرنے کے لئے اٹھالے جاتے ہیں اور دوسری گائے ان کے یہاں پہنچا دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے طے کیا کہ آج کے بعد میں دودھ، مکھن، دہی، کوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔ آج تک میں اسی پر قائم ہوں۔

اس طرح چند تقریریں ہوئیں۔ ۱۲ بجے مائک پر اعلان کیا گیا کہ اب شری پوجیہ مراری باپو کے چرنوں میں پرارتھنا ہے کہ وہ اپنی کتھا سے ہم سب کو آشیرواد دیں۔ حسب معمول آٹھ سازندوں کی ٹیم کے ساتھ انھوں نے اپنی کتھا شروع کی۔ انھوں نے گوسوامی تلسی داس کی رامائن کا ایک حصہ پڑھا۔ کتھا کے آغاز میں بہت دیر تک "شری رام جے رام جے جے رام" کا لفظ آتا تھا۔ ہندو ذہن میں رام کا درجہ وہی ہے جو مسلمان کے ذہن میں خدا کا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ جینی پیشوا نے ان کے جلسہ میں رام پر تنقید کی مگر اس پر کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔

۳۱ جولائی کی شام کو ایک ہندو خاتون مسز دیوی پانڈے کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ میں اور میرے شوہر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد دونوں ملاقات کے لئے آئے۔ انھوں نے مجھ کو یہاں کے فیسٹیول میں دیکھا تھا۔ جب وہ میرے کمرہ میں داخل ہوئے تو ان کو دیکھ کر بظاہر یہ خیال ہوا کہ وہ لندن کے ان ہندستانیوں میں سے ہیں جو یہاں کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر بیٹھنے کے بعد انھوں نے کہا کہ ہم بہت بڑی مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔ یہ کہہ کر دونوں رونے لگے۔ آنسوؤں کے ساتھ انھوں نے اپنی کہانی سنائی۔ یہ کہانی وہی تھی جس کا یہاں کے حالات کے اعتبار سے میں نے پہلے ہی قیاس کر لیا تھا۔ ان کا لڑکا جو پہلے والدین کا بہت وفادار تھا، اب ایک غیر مذہب لڑکی کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔ اکثر وہ اسی لڑکی کے ساتھ رہتا ہے۔ کئی کئی دن گزر جاتے ہیں اور باپ کو اس کا چہرہ دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ ماں نے کہا کہ میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں زہر کھا کر

اپنے کو ہلاک کرلوں۔ باپ نے کہا کہ میری نیند اڑ گئی ہے۔ آجکل میں روزانہ گولی کھا کر سوتا ہوں۔ وغیرہ۔

یوکے کی بظاہر خوشنما زندگی کے پیچھے جو تلخ حقائق ہیں، اس کو اگر لوگ جان لیں تو دہلی کے برٹش ہائی کمیشن میں ویزا کے لئے لائن لگانے والوں کی تعداد بہت کم ہو جائے۔

اگلے دن مذکورہ نوجوان مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ ان سے شادی کے مسئلہ پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ لوگ جس چیز کو لو میریج کہتے ہیں وہ حقیقۃً لسٹ میریج ہوتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو کیوں ایسا ہے کہ لو میریج زیادہ تر ٹوٹ جاتی ہے اور لو رس کے درمیان شکایت کے ساتھ آخر کار جدائی ہو جاتی ہے۔ حقیقی محبت کبھی اس طرح ٹوٹ نہیں سکتی۔ میں نے کہا کہ چند سال کے تجربہ کے بعد آپ مجھے خط لکھئے گا کہ آپ کی بات صحیح تھی یا میری بات۔

فیسٹیول کے منتظمین نے ایک پروگرام مختلف مذاہب کے تعارف کا رکھا تھا۔ ۳۱ اگست کی شام کو سکھ ازم کے تعارف کا دن تھا۔ ہوٹل کے لان میں اس کا انتظام کیا گیا تھا۔ اکال تخت امرتسر کے چیف جتھیدار پروفیسر منجیت سنگھ نے یہ ذمہ داری ادا کی۔ پہلے انھوں نے ہارمونیم پر گرو گرنتھ صاحب کا ایک حصہ پڑھا۔ ہارمونیم وہ خود بجا رہے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے سکھ دھرم کا تعارف کرایا۔

انھوں نے بتایا کہ سکھ دھرم میں گرنتھ (گرو گرنتھ صاحب) کو زندہ گرو مانا گیا ہے۔ امرتسر کے بڑے گردوارہ میں اس کو پالکی پر اِدھر سے اُدھر منتقل کیا جاتا ہے۔ گرو گرنتھ صاحب میں ۳۶ مہاپرشوں کا کلام ہے۔ ہندو اور مسلمان، یہاں تک کہ شودر کا کلام بھی۔ اس میں سدنا قصائی کا کلام بھی موجود ہے جو مسلمان تھے اور قصائی کا کام کرتے تھے۔ پھر ان کو گیان پراپت ہوا اور اپنا پیشہ چھوڑ کر سنت بن گئے۔

گولڈن ٹمپل (سورن مندر) کے بارہ میں انھوں نے بتایا کہ یہ انگریزوں کا دیا ہوا نام ہے۔ اس کا اصل نام ہری مندر صاحب ہے۔ انھوں نے کہا کہ سکھ ازم میں میری اور پیری دونوں ایک ہیں۔ یعنی سیاست اور مذہب دونوں کو ہم ایک سمجھتے ہیں۔ ہمارے یہاں جو مذہبی پیشوا ہوتا ہے وہی سیاسی سردار بھی مانا جاتا ہے۔

ان کی تقریر سننے کے بعد ایک ہندو نے مجھ سے بات کرتے ہوئے کہا: جب گولڈن ٹمپل کا

نام بھی مندر ہے تو پھر ہندو اور سکھ میں جھگڑا کیوں۔

۳۱ اگست کو دن کے کھانے کے وقت میری کرسی سے ملی ہوئی کرسی سوامی چید انند کی تھی۔ اس کے بعد کی کرسی پر ایک صاحب آکر بیٹھ گئے اور سوامی جی سے باتیں کرنے لگے۔ وہ اس قدر سادہ اور بظاہر غیر اہم تھے کہ کوئی ناواقف آدمی ان کو دیکھ کر یہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ یہ کوئی مالدار آدمی ہوں گے۔ سوامی جی نے بعد کو بتایا کہ یہ مسٹر سری چند ہندوجا تھے جو پچاس ہندستانی برلا کے برابر ہیں۔ اس قسم کے ہندو تاجر مغربی ملکوں میں بڑی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ بہت بڑے بڑے بزنس کرتے ہیں اور ہندو اداروں اور تحریکوں کو نہایت فراخ دلی کے ساتھ مالی تعاون دے رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلم ادارے عرب حکمرانوں کے تعاون سے چل رہے ہیں اور ہندو ادارے ہندو تاجروں کے تعاون سے۔ یورپ اور امریکہ میں بہت بڑے ہندو ادارے ہیں جن کا بجٹ کروڑوں ڈالر سالانہ ہوتا ہے۔ یہ سب ہندو تاجروں کے تعاون سے پورا ہوتا ہے۔ آجکل انسائیکلو پیڈیا آف ہندوازم اٹھارہ جلدوں میں چھپ رہی ہے۔ اس میں میکملین (ناشر) نے ۳۳ کروڑ روپیہ لگایا ہے اور ہندو تاجروں نے ۲۰ کروڑ روپیہ فراہم کیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام اسلامی ادارے پٹرو ڈالر کی خداداد دولت کے ذریعہ چل رہے ہیں نہ کہ خود اپنی کمائی ہوئی دولت سے۔ مگر کم از کم میں نے کسی بھی اسلامی ادارے کے لوگوں کو اس پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے نہیں سنا۔ تمام لوگ اس کو خود اپنے فضل و کمال کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جو چیز سب سے زیادہ کیاب ہوگئی ہے وہ یہی شکر ہے۔

ایک کٹر ہندو بھائی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہندستان سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہ ماننا ہے کہ صرف اسلام ہی سچا مذہب ہے۔ دوسرے مذہبوں کو وہ لوگ سچا مذہب نہیں مانتے۔ ایسی حالت میں انڈیا میں ہندو مسلم ایکتا کیسے آسکتی ہے۔ آپ مسلمانوں کو سمجھائیے کہ وہ ہندو مذہب کو بھی اسلام ہی کی طرح سچا مانیں۔ ورنہ ہندستان میں رہنا ان کے لئے مشکل ہوجائے گا۔ میں نے کہا کہ عیسائی لوگ بھی صرف اپنے مذہب کو سچا مذہب سمجھتے ہیں۔ پھر آپ لوگ یہاں کس طرح ان کے ساتھ رہ رہے ہیں۔

جدہ سے نکلنے والے اخبار اردو نیوز کے نمائندہ مسٹر اسلم جمشید پوری نے ۷ جنوری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ خلیج میں بسنے والے ہندستانی مسلمانوں کو آپ کا مشورہ کیا ہے۔ کہا گیا کہ صرف ایک مشورہ ہے۔ یہ کہ وہ ڈبل اسٹینڈرڈ نہ بنیں۔ یہ مسلمان خلیج میں وہاں کے نظام سے آخری حد تک ایڈجسٹ کر کے رہتے ہیں۔ مگر ہندستان میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے وہ ٹکراؤ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ان کو مسلمانوں سے کہنا چاہئے کہ ہم ایڈجسٹ کر کے کامیاب ہیں، تم بھی ایڈجسٹ کر کے کامیابی حاصل کرو۔

۲ دوردرشن (نئی دہلی) نے ۷ جنوری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ٹیلی کاسٹ کیا۔ یہ انٹرویو مساجد کے مسئلہ کے بارہ میں تھا۔

۳ گاندھی پیس فاؤنڈیشن (نئی دہلی) میں ۸ جنوری ۱۹۹۶ کو ایک میٹنگ تھی۔ اس میں بارہ امریکی پروفیسر شریک تھے۔ خصوصی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام اور ہندستانی مسلمان کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ آخر میں سوال وجواب ہوا۔

۴ ورلڈ کانگرس (World Environment Congress) کا چوتھا اجلاس ۱۱ جنوری ۱۹۹۶ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور روحانیت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ انسانیت کی حقیقی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ تشدد اور مادہ پرستی کی فضا ختم کی جائے اور امن اور روحانیت کا ماحول دنیا میں پیدا کیا جائے۔

۵ گووند سدن (مہرولی) میں ۱۴ جنوری ۱۹۹۶ کو ایک جلسہ ہوا۔ شرکاء میں زیادہ تر مغربی ملکوں سے آئے ہوئے لوگ تھے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذہب اور روحانیت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔

۶ گاندھی پیس فاؤنڈیشن (نئی دہلی) میں ۱۵ جنوری ۱۹۹۶ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس کا موضوع انتخابی اصلاح تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور انتخابات کو بہتر بنانے کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۷ ناٹرڈیم یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر فریڈ ڈالمیر (Fred Dallmyr) ۱۷ جنوری ۱۹۹۶ کو اسلامی مرکز میں آئے۔ وہ اسلام کا مطالعہ کر رہے ہیں اور اس پر کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اسلام مکمل طور پر امن کا مذہب ہے۔ اسلام میں جنگ صرف دفاعی ہے اور دفاعی جنگ بھی اس وقت ہے جبکہ اس کو اوائڈ کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی ہو۔

۸ انگریزی روزنامہ ہندستان ٹائمس کے نمائندہ مسٹر راہل دتہ نے ۱۹ جنوری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ایک شخص اپنے مذہب کے لوگوں سے محبت کرتے ہوئے دوسرے مذہب کے لوگوں سے بھی یکساں محبت کر سکتا ہے۔ دونوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ ہر آدمی کا تجربہ ہے کہ وہ اپنی ماں سے محبت کرتے ہوئے یکساں درجہ میں اپنے باپ سے بھی محبت کرتا ہے۔ اسی طرح ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ایک دوسرے سے محبت کر سکتے ہیں۔

۹ اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن (اوکھلا) کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ۱۸ جنوری ۱۹۹۶ کو اس کے تربیتی کیمپ میں شرکت کی اور وہاں ایک تقریر کی۔ موضوع تھا: دعوت کے ضمن میں تاریخی اور نفسیاتی مسائل۔ تقریر کے بعد سوال و جواب کا پروگرام تھا۔

۱۰ مسٹر لوگندر سیکند (جے این یو) تبلیغی جماعت پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ ۲۲ جنوری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز سے ملے اور تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ تبلیغی جماعت مکمل پیغمبرانہ کام کر رہی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ تبلیغی جماعت ایک نہایت مفید کام کر رہی ہے۔ وہ مسلمانوں کو لڑائی جھگڑے سے ہٹا کر انھیں دینی کاموں میں مشغول کر رہی ہے۔

۱۱ بھوپال کے سالانہ تبلیغی اجتماع (۱۶-۱۸ اکتوبر ۱۹۹۵) میں ہر سال کی طرح اس بار بھی مکتبہ الرسالہ کا اسٹال لگایا گیا۔ ہر طبقہ کے تعلیم یافتہ افراد نے الرسالہ مشن سے دلچسپی کا اظہار کیا اور بڑی تعداد میں کتابیں حاصل کیں۔

۱۲ ۱۱ نومبر ۱۹۹۵ کو کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع مذہب، سیاست اور جرائم تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ اور موضوع پر ایک تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ مذہب بذات خود محبت اور انسانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر کچھ لوگ مذہب کا غلط استعمال کرکے اس کو بدنام کرتے ہیں۔ تاہم مذہب کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لئے مذہب کی اصولی تعلیمات کو دیکھنا چاہئے نہ کہ کچھ لوگوں کی طرف سے مذہب کے غلط استعمال کو۔

۱۳ ۱۳ نومبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز نے میوات (ہریانہ) کا دورہ کیا۔ اس سلسلہ میں مختلف لوگوں سے ملاقات کی۔ اور علاقہ کے حالات کا جائزہ لیا۔ اس دورہ کی تفصیل انشاء اللہ "نیا میوات" کے عنوان سے الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۴ جاپان ایمبیسی (نئی دہلی) میں ۲۲ دسمبر ۱۹۹۵ کو ایک علمی میٹنگ ہوئی۔ اس میں جاپان کے سفیر کے علاوہ ٹوکیو یونیورسٹی کے دو جاپانی پروفیسر ڈاکٹر یما کاجی (Yamakage) اور ڈاکٹر یموچی (Dr. M. Yamauchi) شریک ہوئے۔ دہلی کے کچھ سنیئر پروفیسر بھی اس میں موجود تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے سفیر جاپان کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ انھوں نے وہاں اپنی تقریر میں کہا کہ انڈیا سب سے بڑا مسلم ملک ہے۔ اور یہاں مسلمانوں کے لئے دوسرے مسلم ملکوں سے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔

۱۵ فاؤنڈیشن آف ایمیٹی اینڈ نیشنل سالیڈیریٹی (دہلی) کی طرف سے ۲۳ دسمبر ۱۹۹۵ کو پارلیمنٹ انکسی میں ایک فنکشن بڑے پیمانہ پر کیا گیا۔ یہ فاؤنڈیشن کی گیارہویں سالگرہ پر کیا گیا تھا۔ اس میں پرائم منسٹر نرسمہا راؤ بھی شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ انڈیا مسلمانوں کے لئے پرابلم کنٹری نہیں ہے۔ یہاں ان کے لئے ہر قسم کی ترقی کے امکانات موجود ہیں۔

۱۶ سری نگر کی ٹی وی ٹیم نے ۲۴ دسمبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کے پانچ لکچر ریکارڈ کئے۔ ان تقریروں کا مشترک موضوع تھا: جدید دور میں اسلامی فکر۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام ہماری زندگی کے ہر مرحلہ میں کامیاب رہنمائی دیتا ہے۔ تاہم ہر زمانہ میں ضرورت ہوتی ہے کہ نئے حالات کو سمجھا جائے اور اسلام کو از سر نو وقت کے حالات پر منطبق کیا جائے۔

۱۷ میڈیا اسٹار (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر نقوی نے ۴ اپریل ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر شخصی تجربات اور الرسالہ مشن کے بارے میں تھا۔ آنے والے ملکی انتخابات سے متعلق ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ حالت میں ہندستانی ووٹر کے لیے جو چوائس ہے وہ مسٹر کرپٹ اور مسٹر کلین کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ اصل چوائس مسٹر کرپٹ اور شری بھرشٹ کے درمیان ہے۔ ایسی حالت میں ملک کے سیاسی مستقبل کی تعمیر کے لیے الکشن کا رول بہت کم ہو جاتا ہے۔

۱۸ ارن کول پروڈکشن (نئی دہلی) نے دوردرشن کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹر
۲۶ دسمبر ۱۹۹۵ کو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ کشمیر کے مسلمان اقبال کے پرستار ہیں۔ مگر وہ اقبال کے اس شعر کا مصداق بن رہے ہیں:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

۱۹ انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر پارسا وینکٹیشور راؤ نے ۲۶ دسمبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے تازہ مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستانی مسلمان اب مایوسی کے دور سے نکل کر امید اور اعتماد کے دور میں پہنچ گئے ہیں۔ اب کوئی بھی چیز ان کی ترقی کو روکنے والی نہیں۔

۲۰ کیتھڈرل چرچ آف ریڈیمپشن (نئی دہلی) میں کرسمس کے موقع پر ۲۷ دسمبر ۱۹۹۵ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مختلف فرقوں اور مذہبوں کے درمیان میل ملاپ کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کی نمائندہ مسز کنچنا نے ۲۹ دسمبر ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ ۱۹۹۶ ملک کے لئے کیسا سال ہوگا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ خدا نے اس دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہر نراشا کے ساتھ ایک آشا کا پہلو موجود ہو۔ اس لئے یقینی ہے کہ آنے والا سال امیدوں کا سال ہوگا۔

۲۲ اکھل بھارتیہ رچناتمک سماج کے تحت چترکوٹ (مدھیہ پردیش) میں ۳۰ - ۳۱ دسمبر ۱۹۹۵ کو آل انڈیا سمیلن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ وہاں خطابات اور ملاقاتوں کا پروگرام رہا۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ الرسالہ میں سفر نامہ کے ذیل میں شائع کر دی جائے گی۔

۲۳ ہندی روزنامہ ہندستان (دہلی) کے نمائندہ مسٹر اودھیش کمار نے ۲ جنوری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ہندستانی مسلمانوں کے سیاسی مسائل سے متعلق تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کے لئے بہترین انتخابی پالیسی یہ ہے کہ اس معاملہ میں وہ کوئی آل انڈیا پالیسی نہ بنائیں بلکہ مقامی حالات کے لحاظ سے اپنی پالیسی وضع کریں۔

۲۴ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۲ جنوری ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا: معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں مذاہب کا رول۔ اس میں بتایا گیا کہ معاشرہ کو بنانے میں مذہب کا رول نہایت بنیادی ہے۔ انسانی معاشرہ میں اسی وقت سے بگاڑ آیا ہے جب کہ اس پر سے مذہب کا اثر کم ہو گیا۔

۲۵ سمواد پریکر ماٹیلیوژن کی ٹیم نے اے این آئی کے لئے ۵ جنوری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ اگلے الکشن میں مسلمانوں کی سیاست کا رخ کیا ہوگا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان اب زیادہ حقیقت پسند ہو گئے ہیں۔ امید ہے کہ اس بار ان کی بڑی تعداد منفی ووٹ نہ دے کر مثبت ووٹ دے گی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینہ) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

	Rs.
...ان جلد اول	200/-
...ذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
...یغمبرِ انقلابؐ	40/-
...ہب اور جدید چیلنج	45/-
...ظمتِ قرآن	35/-
...ظمتِ اسلام	50/-
...عظمتِ صحابہ	7/-
...دینِ کامل	60/-
الاسلام	40/-
...ظہورِ اسلام	50/-
...سلامی زندگی	25/-
...حیارِ اسلام	35/-
...رازِ حیات	50/-
...صراطِ مستقیم	40/-
...خاتونِ اسلام	50/-
...سوشلزم اور اسلام	40/-
...دورِ عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	–
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	–
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-

تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعۂ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	80/-
کتاب زندگی	55/-
انوارِ حکمت	–
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	25/-
عقلیاتِ اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
حیات طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-

نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	45/-
تعددِ ازواج	10/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	12/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	2/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدی (عربی)	85/-

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھویش	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اُور	3/-

آڈیو کیسٹ	Rs.
حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	25/-
رسول اللہؐ کا طریق کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

	Rs.
God Arises	95/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	20/-
The Teachings of Islam	25/-
The Good Life	20/-
The Garden of Paradise	25/-
The Fire of Hell	25/-
Man Know Thyself!	8/-
Muhammad: The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	10/-
Words of the Prophet	75/-
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam and Western Society	95/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

الرسالہ

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel : 4611128, 4697333 Fax : 91-11-4697333